الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ اپنی غلطی کی قیمت دوسروں سے وصول نہیں کرسکتے۔
اور بلاشبہ یہ زندگی کی سب سے زیادہ تلخ حقیقت ہے

شمارہ ۳۹
فروری ۱۹۸۰

زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

فروری ۱۹۸۰
شمارہ ۳۹

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کے مسائل قرآن میں	۲	مجھ پر دولت کی بجلی گری ہے	۱۲
بھیڑ کے درمیان سناٹا	۳	الفاظ کا نام دلیل نہیں	۱۳
کیسی عجیب بات	۳	یہ خوش خیال مفکرین	۱۴
انسانوں کی تین قسمیں	۴	تذکیر القرآن ــــــ بقرہ	۱۹
اپنی ہستی کا نذرانہ	۴	تذکیر القرآن ــــــ آل عمران	۲۹
کہنے اور کرنے کا فرق	۵	اسلامی زندگی ــــــ	۳۱
زندگی کا راز باہمی اتفاق	۶	سیرت کی روشنی میں	
قل ھو اللہ شریف سے	۷	مذہب کیا ہے	۳۳
شور و غل کام نہیں	۷	دونوں کا دین ایک	۳۵
صلاحیتیں کام نہ آسکیں	۸	امتحان کس بات کا	۳۷
پہلے شعور پیدا کیجئے	۹	فطرت کی تصدیق	۳۹
آغاز سے پہلے	۹	حق کا انکار کرنے والے	۴۰
اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا	۱۰	دین میں الحاد	۴۱
کیا اس کا بنانے والا نہیں	۱۱	قولی ایمان اور قلبی ایمان	۴۲
تلاش کا صحیح جواب	۱۱	آپ کے لئے عملی پروگرام	۴۴

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی **Al-Risala Monthly** لکھیں

نماز کے مسائل قرآن میں

"نماز کے مسائل" کا لفظ بولا جائے تو ذہن عام طور پر ان جزئی آداب کی طرف چلا جاتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اسی لئے جب کسی کو نماز کے "مسائل" کی تلاش ہوتی ہے تو وہ فقہ کی کتاب دیکھتا ہے۔ مگر نماز کے مسائل کا تعلق صرف اس کے جزئی آداب سے نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس کا تعلق نماز کے مقصد اور اس کے بنیادی پہلوؤں سے ہے۔ نماز کے جزئی آداب بلاشبہ فقہ کی کتابوں ہی میں ملیں گے۔ مگر جہاں تک نماز کے اساسی امور کا تعلق ہے وہ مکمل طور پر قرآن میں موجود ہیں اور قرآن کے تتبع سے واضح طور پر ان کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز میں جزئی آداب کا اہتمام تو خوب کرے گا۔ مگر نماز کے جو بنیادی اور مقصدی پہلو ہیں ان کی طرف سے غافل رہے گا۔ کیوں کہ وہ ان کو نماز کے "مسائل" نہیں سمجھتا ——— یہاں اس سے متعلق قرآن کے کچھ حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ہر نماز کا ایک وقت ہے اور اس کی ادائگی میں وقت کی پابندی ضروری ہے	ان الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتا، نساء	۱۰۳
جب نماز پڑھی جائے تو صاف پاک ہو کر پڑھی جائے ———	اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسلوا	مائدہ ۶
نماز کے وقت اپنے کو ماحول سے الگ کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہونا ———	واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا	مزمل ۸
نماز اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی کا شعور اس کے ساتھ جڑا ہوا ہو ———	لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاری	نساء ۴۳
نماز آدمی کے اوپر نگراں بن جائے جو اس کو برے کاموں سے روکے ———	ان الصلاۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر	عنکبوت ۴۵
نماز آدمی کو اللہ کی یاد کرنے والا بناتی ہے ———	اقم الصلاۃ لذکری	طہ ۶
نماز کے وقت آدمی کے اوپر سنجیدگی کی حالت طاری ہونا چاہئے ———	الذین ھم فی صلاتہم خاشعون	مومنون ۲
جب نماز کا وقت آجائے تو کام چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑنا چاہئے ———	فاسعوا الی ذکر اللہ	جمعہ ۹
نماز نمازیوں کے لئے ایک ہو کر رہنے کی تربیت ہے ———	وارکعوا مع الرٰکعین	بقرہ ۴۳
نماز ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ آدمی خدا کی مدد کا طالب ہوتا ہے ———	استعینوا بالصبر والصلاۃ	بقرہ ۱۵۳
نماز میں مشغول ہو کر آدمی کو خدا کی نزدیکی کا تجربہ ہوتا ہے ———	واسجد واقترب	علق 19
نماز جاہلی طریقوں کو چھوڑ دینے کا سبق دیتی ہے ———	اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا	ھود ۸۷
نماز آدمی کے اوپر اس طرح چھائے کہ وہ اس کی پہچان بن جائے ———	سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود	فتح ۲۹
نماز آدمی کے لئے اس کی تنہائیوں کی ساتھی ہے ———	والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما	فرقان ۶۴
نماز ہر آدمی پر ساری عمر کے لئے فرض ہے ———	ھم علیٰ صلاتھم دائمون	معارج ۲۳
نماز حفاظت کی چیز ہے جس طرح مال حفاظت کی چیز ہے ———	حافظوا علی الصلوات	بقرہ ۲۳۸
نماز کا مطلب خوف آخرت کی وجہ سے خدا کے سامنے گر پڑنا ہے ———	ساجدا وقائما یحذر الآخرۃ	زمر ۹
نماز میں آدمی کو عاجز بندہ کی طرح کھڑا ہونا چاہئے ———	قوموا للہ قانتین	بقرہ ۲۳۸

بھیڑ کے درمیان سناٹا

نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر اللہ کے خوف سے جھکنے والے نظر نہیں آتے۔ دین کی خاطر بولنے والے بہت ہیں مگر دین کی خاطر چپ ہو جانے والا کوئی نہیں۔ ملت کو بربادی سے بچانے کے لئے ہر ایک مجاہد بنا ہوا ہے مگر فرد کو بربادی سے بچانے کے لئے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ اپنی حق پرستی کو جاننے کا ماہر ہر ایک ہے مگر دوسرے کی حق پرستی کو جاننے کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ چوک پر خدا پرستی کا مظاہرہ کرنے والوں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر تنہائیوں میں خدا پرست بننے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اسلام کو مکمل نظام ثابت کرنے کے لئے ہر شخص زبان وقلم کا زور صرف کر رہا ہے مگر اسلام کے جس "جزئی نظام" کا تعلق اس کی اپنی ذات اور خاندان سے ہے اس کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔ خدا کے دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے۔ مگر خدا کے دین کو اپنی زندگی میں غالب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ جنت کی کنجیوں کے گچھے ہر ایک کے پاس ہیں مگر جہنم کے اندیشے سے تڑپنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیوی رونق والے اسلام کی طرف ہر شخص دوڑ رہا ہے مگر اس اسلام سے کسی کو دلچسپی نہیں جو زندگی میں آخرت کا زلزلہ پیدا کر دے ——— انسانوں کی بھیڑ میں سناٹے کا یہ عالم شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

کیسی عجیب بات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں جو یہودی علماء تھے وہ گویا اس زمانہ میں خدائی مذہب کے وارث تھے۔ ان کا مذہبی درجہ تمام لوگوں کے نزدیک مسلّم تھا۔ انھوں نے اپنی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے آپ کو رد کر دیا۔ مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ جس کو وہ رد کر رہے ہیں وہی وہ شخص ہے جس کو اللہ نے ان کی خدا پرستی کی جانچ کے لئے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو رد کر کے بظاہر حمایت دین کا کریڈٹ لے رہے تھے۔ مگر اللہ کے یہاں وہ اس بات کے مجرم بن رہے تھے کہ اپنے آپ کو انھوں نے گروہی تعصبات کے خول میں اتنا زیادہ بند کر لیا کہ سچائی ان کو اپنے اصلی روپ میں نظر نہ آسکی۔ مکہ کے لوگ دین ابراہیمی کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ یہودی اپنے کو انبیائے بنی اسرائیل کا وارث کہتے تھے۔ مگر دونوں نے اسی انسان کا انکار کر دیا جو حضرت ابراہیمؑ کے دین کو اور بنی اسرائیل کو دی جانے والی آسمانی کتابوں کو اس کی اصلی صورت میں ان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں جس طرح ہدایت کے مواقع رکھے گئے ہیں اسی طرح گمراہی کے راستے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں جو شخص حق کی آواز کو رد کرنا چاہے اس کو بآسانی ایسے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں جن کو بول کر وہ اپنے آپ کو جھوٹے یقین میں مبتلا کرے۔ یہاں دین کی سچی دعوت کو نظر انداز کر کے بھی آدمی ایسے در و دیوار پا لیتا ہے جس کے سایہ میں وہ پناہ لے سکے۔ یہاں خدا کی پکار کی طرف سے اپنے کانوں کو بند کر کے بھی ایسی چٹانیں مل جاتی ہیں جو کسی کو یہ تسکین دے سکیں کہ اس نے اپنے لئے ایک مضبوط سہارا دریافت کر لیا۔ مگر جب پردہ ہٹے گا تو یہ چیزیں اتنی بے معنی ثابت ہوں گی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

انسانوں کی تین قسمیں

ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ وہ اس طرح زندگی گزارے گویا وہ اپنے آپ پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی تمام نظر آنے والی طاقتوں سے زیادہ اس کا اندیشہ رکھتا ہو۔ وہ خدا کے پاس ایسا دل لے کر پہنچے جو دنیا کی زندگی میں ہمیشہ خدا کی طرف متوجہ رہا ہو۔ یہی اللہ کے مطلوب اور محبوب بندے ہیں۔ جب اللہ کی خاطر وہ دنیا کا تعب اٹھا کر آخرت میں پہنچیں گے تو ان کا رب ان کو خوش آمدید کہے گا اور فرمائے گا کہ ہرے بھرے باغوں والے جنتی مکانات میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو۔ یہاں تمھارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو۔ اور ہمارے اتھاہ انعامات اس کے علاوہ ہیں (ق ۳۵-۳۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ تاہم ان سے کوتاہیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ٹھیک کام میں برا کام بھی شامل ہوتا رہا۔ مگر اس کمزوری کے باوجود وہ ڈھیٹ نہیں بنے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی مانگتے رہے اور بار بار اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امید ہے کہ اللہ ان کو بھی اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا۔ وہ جب خدا کی طرف لوٹے تو خدا بھی ان کی طرف لوٹے گا۔ کیوں کہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے (توبہ ۱۰۲)

اس کے بعد تیسرا گروہ وہ ہے جس نے نفس پرستی، دنیا طلبی اور گھمنڈ کو اپنا دین بنایا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے لئے نہیں جیے بلکہ اپنے لئے جیے۔ انھوں نے آخرت کی فکر نہیں کی، بلکہ دنیا کی فکر کی۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کی اخروی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کر لیں۔

یہ اپنی ہستی کا نذرانہ پیش کرنا ہے

بائبل میں اسرائیل کی ایک نیک بخت خاتون حنہ کا قصہ لکھا ہے۔ ایک بار وہ خدا سے دعا کر رہی تھی۔ وہ "دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ فقط اس کے ہونٹ ہلتے تھے۔ پر اس کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی"۔ اس وقت حنہ پر کچھ ایسی وارفتگی کی کیفیت طاری تھی کہ عیلی کاہن نے اس کو دیکھا تو اس کو "گمان ہوا کہ وہ نشہ میں ہے۔ عیلی نے اس سے کہا کہ تو کب تک نشہ میں رہے گی اپنا نشہ اتار"۔ مگر یہ نشہ کا معاملہ نہ تھا۔ حنہ نے جواب دیا: نہیں اے میرے مالک، میں تو غمگین عورت ہوں میں نے نہ تو مے اور نہ کوئی نشہ پیا۔ پر میں نے خداوند کے آگے اپنا دل انڈیلا ہے (۱۔ سموئیل ۱)

اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عبادت کی حقیقت عجز ہے۔ دنیا میں انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اللہ کے سامنے عاجز بن کر رہے۔ اس کی کوئی حاجت ہو تو اس کے لئے وہ اللہ سے گڑگڑائے۔ کسی سے معاملہ پڑے تو اللہ کی خاطر صاحب معاملہ کے سامنے جھک جائے۔ کسی سے اختلاف ہو تو اللہ کے خوف سے اپنے کو انصاف کی رسی میں باندھ لے۔

کہنے اور کرنے کا فرق

قرآن میں شاعروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کو وہ کرتے نہیں (شعراء ۲۲۶) شاعری کے طور پر بات کہنے کی یہ کمزوری کبھی خود اہل دین میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دین و ملت کے بارے میں تقریریں کرتے ہیں اور کتابیں چھاپتے ہیں، مگر دین ان کا حقیقی عملی فیصلہ نہیں ہوتا ——— "اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں (صف ۳)

آدمی جب بولتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی حقیقی عملی زندگی کا ایک اظہار ہوں، جس طرح بھاپ ایک گرم پانی کا اظہار ہوتی ہے یا دھواں کسی جلتی ہوئی چیز کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جب بولتا ہے تو وہ اپنے اندرون کو انڈیل رہا ہوتا ہے، اس کے الفاظ عام معنوں میں صرف الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ اس کی اپنی ہستی ہوتی ہے جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ میں انتہائی واقعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی تصویر کی خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس کے بیانات میں کیمرہ کے فوٹو کی طرح حقیقی عکاسی کی شان آجاتی ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہ خود بھی وہی ہوتا ہے۔ اس لئے جب کسی انسان کو اس کے ساتھ عملی تجربہ پیش آتا ہے تو وہ اس میں کوئی تضاد نہیں پاتا۔ بولنے والا اگر اسٹیج پر ہمدردی کے الفاظ بول رہا تھا تو عملی تجربہ میں بھی وہ ملت کا ہمدرد ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ احتساب نفس پر وعظ کر رہا تھا تو موقع پڑنے پر وہ خود بھی اپنی ذات کا حساب لینے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ عہد و پیمان کی پختگی کی تلقین کر رہا تھا تو جب امتحان کا وقت آتا ہے تو وہ خود بھی عہد و پیمان کو پورا کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ انصاف اور انسانیت کا پرچار کر رہا تھا تو عملی تجربہ میں وہ ایک ایسا شخص ثابت ہوتا ہے جو خود بھی معاملہ کے وقت انصاف اور انسانیت پر قائم رہنے والا ہو۔

اس کے برعکس دوسرا آدمی وہ ہے جس کا اسلام پر بولنا شاعروں جیسا بولنا ہو۔ اس کی زبان الگ ہوتی ہے اور اس کی عملی زندگی الگ۔ اس کی باتوں میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو صرف ایک مطابق واقعہ کلام میں ہوا کرتی ہے۔ اس کا کلام ایک قسم کی شاعری ہوتا ہے نہ کہ حقیقت بیانی۔ لکھنے یا بولنے کے وقت تو وہ "اسلامی" نظر آتا ہے لیکن اگر کوئی نازک معاملہ پڑ جائے تو فوراً اس کی اصل ہستی ننگی ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ شخص جس نے اسٹیج پر انسانیت کا وعظ کہا تھا، عملی تجربہ میں وہ انسان کی صورت میں بھیڑیا ثابت ہوتا ہے۔ وہ جس ملت کی ہمدردی کی باتیں کر رہا تھا، حقیقی معاملہ میں اسی ملت کے ایک فرد کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ خوف خدا اور فکر آخرت کی باتیں کر رہا تھا مگر عملی تجربہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں ایک بالکل بے خوف دل ہے جس کو آخرت اور حساب کتاب کی مطلق کوئی فکر نہیں۔ شاعری والا اسلام موجودہ دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ دے سکتا ہے۔ یہاں اسلامی مشاعرہ کی مجلسوں میں اس کو داد مل سکتی ہے۔ مگر ایسے اسلام کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہ ہوگی۔ خدا کو الفاظ سے نہیں حقیقت سے دلچسپی ہے۔ اس کو وہ شاعر مطلوب ہے جو آخرت کی پکڑ کے خوف سے اپنی شاعری بھول جائے۔ اس کو وہ ادیب مطلوب ہے جس کی بے نفسی اس کو اپنا قلم توڑنے پر مجبور کر دے۔ اس کو وہ زبان مطلوب ہے جو زبان رکھتے ہوئے خدا کی خاطر بے زبان ہو جائے۔

زندگی کا راز: باہمی اتفاق

"مملکت عربیہ سعودیہ" ابتداءً ۱۹۰۲ میں قائم ہوئی۔ عرب ممالک میں عام طور پر بہت جلد جلد حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر سعودی حکومت کسی انتشار کے بغیر قائم ہے۔ اس کی اس کامیابی کا راز اتحاد ہے۔ چند ماہ پہلے امریکہ کی سی آئی اے نے اپنی حکومت کو ایک رپورٹ دی۔ اس رپورٹ میں "انکشاف" کیا گیا تھا کہ سعودی عرب کے شاہی خاندان میں اندرونی اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ایک مغربی سفیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک سعودی شہزادہ نے کہا:

If there is one thing this royal family is agreed on, it is its own survival. We do not survive by fighting each other.

اگر کوئی چیز ہے جس پر سعودی عرب کا شاہی خاندان متفق ہے تو یہ اس کا اپنے وجود کو باقی رکھنا ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑیں تو ہم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ نومبر ۱۹۷۹)

زندگی کا یہ راز جس کو عرب کے شاہی خاندان نے جان لیا اگر مسلم قومیں بھی اس کو جان لیں تو مسلم دنیا اچانک اتنی طاقت ور ہوجائے کہ وہ تمام مسئلے خود بخود حل ہوجائیں جن کے لئے قربانیوں پر قربانیاں دی جارہی ہیں اور وہ کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتے۔ کسی مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے تو مسلمان بار بار متحد ہوجاتے ہیں۔ مگر اسلام کے احیاء اور ملت کی تعمیر کے لئے ان میں اتحاد نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ اتحاد جو مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر وجود میں آگیا تھا وہ دشمن کے ہٹتے ہی اچانک ختم ہوجاتا ہے۔ مثبت مقصد کے لئے جب اتحاد نہ ہوسکے تو منفی مقاصد کے لئے اتحاد کی کوئی قیمت نہیں۔ اس قسم کا اتحاد مرض کی علامت ہے نہ کہ صحت مند ہونے کی علامت۔ اگر اصل مقصد "اسلام" کو کرسی پر بٹھانا ہو تو کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ "دشمن اسلام" کے ہٹتے ہی لوگ متفقہ طور پر اسلام کو کرسی پر بٹھا کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جائیں گے۔ مگر جب ہر شخص اپنے کو کرسی پر بٹھانا چاہے تو اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کرسی تو ایک ہی ہے۔ پھر سارے لوگ بیک وقت اس پر کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ جاہ طلبی اختلاف پیدا کرتی ہے اور اسلام طلبی اتحاد۔

کسی گروہ میں اتحاد نہ ہو تو اس کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفادات کو بچانے کی خاطر بڑی اجتماعیت کا جزء نہیں بنتے۔ دس چھوٹے حلقے ہوں تو دس آدمیوں کو صدارت حاصل ہوگی۔ اور اگر ان کو ملا کر ایک حلقہ بنا دیں تو صرف ایک شخص عہدہ حاصل کرسکے گا۔ اس لئے جاہ طلب لوگ اتحاد میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ افراد عرصہ تک ایک حلقہ سے جڑے رہیں تو بالآخر ان کے اندر عصبیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اپنی ہر چیز کے حق میں وہ ایک قسم کا تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے حلقہ کو عظیم تر اجتماعیت میں ملانے کو ایسا ہی خیال کرنے لگتے ہیں جیسے مقدس کعبہ کو کوئی اپنے ذاتی مکان میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر جو لوگ کسی حلقہ سے وابستہ نہ ہوں ان کی رکاوٹ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اجتماعیت کو اپنی آزاد زندگی کے لئے بندھن محسوس کرتے ہیں — اتحاد بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر اتحاد ہمیشہ ذات کی نفی کی قیمت پر قائم ہوتا ہے۔ اور قربانی کی یہ قسم ہمیشہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز رہی ہے۔

قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان

نماز ختم ہوئی تو مسجد میں ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا: "تھوڑی دیر کے لئے سبھی لوگ ٹھہر جائیں۔ میں آپ کو قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان سناؤں گا" لوگوں کو یہ بات انوکھی معلوم ہوئی اور نمازیوں کی بڑی تعداد اس انوکھی تقریر کو سننے کے لئے ٹھہر گئی۔ بزرگ موصوف نے تقریر شروع کی۔ مگر اس میں زیادہ تر اپنے مدرسہ کا تعارف اور اس کے لئے چندہ کی اپیل تھی۔ ایک شخص سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ درمیان تقریر میں بولا: حضرت آپ نے تو کہا تھا کہ قل ھو اللہ شریف سے شہادت کا بیان سنائیں گے۔ مگر وہ آپ نے نہیں سنایا۔ بزرگ موصوف بولے ——— "ارے بھائی! امام حسین جو کربلا میں شہید ہوئے، قل ھو اللہ شریف انھیں کے نانا جان پر تو اتری تھی"۔

بظاہر یہ ایک شخص کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسی نادانی میں آج ہماری تمام قیادت مبتلا ہے۔ ہر قائد کے پاس ایک انوکھا نسخہ ہے اور اس کو وہ ملت کے تمام مسائل کا حل بتا کر بہت سے مسلمانوں کو جمع کر لیتا ہے۔ اس کے انوکھے نسخہ سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ اس کو چندہ دیتے ہیں۔ بہت سے اس کے جلسہ گاہ میں شریک ہو کر اس کی شان قیادت کو بڑھاتے ہیں۔ مگر سب کچھ کر لینے کے بعد جب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو لوگ پوچھتے ہیں: حضرت! جو امید دلا کر آپ نے ہم کو دوڑایا تھا وہ تو پوری نہیں ہوئی۔ اب قائد سامنے آتا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ایسے نتیجہ کی خبر دیتا ہے جس کا عوام نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔ شہادت کا بیان قل ھو اللہ شریف سے برآمد ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سمجھنے والے اب بھی اس کو سمجھنے سے عاجز رہے ہوں۔

جب شور و غل کو کام سمجھ لیا جائے

عرب کے مشرکین معروف معنوں میں لامذہبی لوگ نہیں تھے بلکہ مذہب کو ماننے والے لوگ تھے۔ حتیٰ کہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے۔ البتہ ان کی نماز یہ تھی کہ خدا کے گھر میں جمع ہو کر تالیاں بجاتے اور سیٹی کی آوازیں نکالتے (ماکان صلاتھم عند البیت الا مکاء وتصدیۃ انفال ۳۵) مشرکین کی یہ سنت اب بھی مشرکانہ عبادت گھروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم شور و غل کو عبادت سمجھنے میں نام نہاد غیر مشرکین بھی ان سے زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ مزاروں پر قوالیاں، شب برات کے تماشے، میلاد کے ہنگامے، تقریبات میں لاؤڈ اسپیکر پر "اسلامی گانوں" کی ریکارڈنگ، سب اسی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس بدعت کے اثرات بہت دور تک ہماری زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسائل ملت کے نام پر آئے دن کانفرنسوں اور کنونشنوں کی دھوم، دینی سیاست کے نام پر توڑ پھوڑ اور ایجی ٹیشن، اسلامی حکومت کے کے قیام کے نام پر کوڑوں اور گولیوں کی جھنکار، سب اسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لوگ شور و غل کو دین سمجھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ خدا کی دنیا خاموش سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اپنی آواز کو پست رکھو کیوں کہ آوازوں میں سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۹) گدھا اللہ کی طرف سے ناپسندیدہ آواز کا ایک نمونہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ اس طرح چیخ و پکار میں مشغول ہیں جیسے ان کو تمام آوازوں میں یہی آواز سب سے زیادہ پسند آگئی ہو۔

صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷ــ۱۸۹۶) مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ــ۱۸۸۷) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا سہیل کی علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے زمانہ کا ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ کا واقعہ ہے۔ یونین میں "ام الالسنہ عربی" پر پروفیسر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔ مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے۔ یونین میں مجمع دیکھا تو کہا: مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سنتے چلیں۔ مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے، جلد اٹھ آئیں گے۔ سب لوگ یونین میں آئے۔ مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے۔ سر پر اونی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا (شیڈ) لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک تقریر کی۔ حاضرین محو حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچا دیا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میز کے پاس کھڑے کیے گئے۔ تھوڑی سی ناک، اس سے ذرا بڑی تھوڑی اور ہاتھ کی صرف انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کر دی۔ اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لئے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا سہیل نے بھی "ام الالسنہ عربی" پر تقریر شروع کی۔ پون گھنٹہ تک تقریر کی۔ نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی۔ نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دل نشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ کمال الدین نے بے اختیار ہو کر مولانا کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا: "تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں" (مضامین رشید، صفحہ ۴۳)

مولانا اقبال احمد سہیل ایم اے، ایل ایل بی غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ ان کو عربی، انگریزی اور فارسی پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر یہ ہیں:

اگر کچھ مرتبہ چاہے تو اس ہستی کو باطل کر — کہ دانہ بار ور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر

اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو — ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرّ قو کی

اسلامی دعوت کا کام وہ انتہائی اعلیٰ معیار کے ساتھ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی تمام صلاحیتیں شاعری اور وکالت کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جو فطرت سے اعلیٰ درجہ کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے۔ مگر ان کی اعلیٰ صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے لگے رہے یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے گئے۔

پہلے شعور پیدا کیجئے

مسجد کا موذن فجر سے کچھ پہلے اٹھا۔ وہ کسی ضرورت سے مسجد کے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی دکان کھول رہا ہے۔ چوں کہ ابھی فضا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اتنے سویرے دکان کھولنا ایک غیر معمولی بات تھی، وہ ٹھہر کر دیکھنے لگا۔ "یہ آدمی اندھیرے میں دکان کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کیا کام کرے گا" اچانک یہ سوال اس کے ذہن میں آیا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس کے دل نے کہا کہ یہ شخص سب سے پہلے دکان کی لائٹ جلائے گا۔ کیوں کہ جب تک دکان کے اندر اندھیرا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔" اب وہ اپنے اندازہ کی تصدیق یا تردید جاننے کے لئے وہاں ٹھہر کر دکان دار کو دیکھنے لگا۔ مؤذن کا اندازہ صحیح نکلا۔ دکان کا دروازہ کھولتے ہی دکان دار کا ہاتھ سب سے پہلے بجلی کے بٹن پر پہنچا۔ معاً بعد دکان کے اندر روشنی ہوگئی۔ اب دکان دار اس کے اندر داخل ہو کر اپنا کام کرنے لگا۔

اسی مثال سے ہم دین وملت کے معاملہ کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ دینی یا ملی کام کرنے کے لئے بھی سب سے پہلے "روشنی" جلانے کی ضرورت ہے یعنی شعور کی بیداری۔ اندھیرے مکان یا دکان کو اجالے میں لانے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ملت کے اندر کوئی حقیقی اور مفید کام وجود میں لانے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ملت کے افراد کو ذہنی حیثیت سے باشعور بنایا جائے۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بیدار کیا جائے۔ افراد کے اندر شعور کی روشنی جلائے بغیر کوئی حقیقی کام نہیں کیا جا سکتا۔

آغاز سے پہلے اختتام کا اندازہ کر لیجئے

حاجیوں کا ایک قافلہ غار حرا کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ غار حرا جس پہاڑ کے اوپر واقع ہے وہاں تک سڑک جاتی ہے۔ آدمی پہاڑ تک سواری سے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پیدل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ قافلہ کے لوگ جب پہاڑ پر چڑھنے لگے تو کچھ لوگوں نے احترام وتقدس کے جذبہ کے تحت سڑک کے پاس اپنے چپل اتار دئے۔ جاتے وقت صبح کا وقت تھا اس لئے ننگے پاؤں اوپر جانے میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر جب وہ لوگ واپس لوٹے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ پہاڑی کے سرخ پتھر تپنے لگے تھے۔ بغیر چپل والے لوگ سخت تکلیف کے ساتھ اس حال میں اترے کہ ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ کئی دن تک پریشان رہے۔

سفر خواہ پہاڑ کا ہو یا زندگی کا، ہر ایک کی کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ اور وہ یہ کہ سفر کے آغاز میں سفر کے اختتام کا پورا اندازہ کر لیا جائے۔ جو شخص سفر کے شروع میں سفر کے آخری حالات کا اندازہ نہ کر سکے اس کے حصہ میں اکثر ایسی مشکلات آتی ہیں جو اس کے سفر کے مقصد کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ خدا کا یہ قانون اتنا بے لاگ ہے کہ ایک مخلص آدمی بھی اس قسم کی غلطی کرنے کے بعد اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔ اگر وہ اچھی نیت سے ایک ایسا اقدام کر بیٹھے جس کے عواقب پر اس نے غور نہ کیا ہو تو اس دنیا میں اس کے برے نتائج سے وہ بھی اسی طرح دوچار ہوگا جس طرح ایک بدنیت شخص اس قسم کی غلطی کر کے دوچار ہوتا ہے۔ کسی کا اخلاص اس کی غلطی کے خلاف اس کا محافظ نہیں بن سکتا۔

اس کو اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹ — ۱۹۵۵) نے ۲۰ویں صدی کی سائنس میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ مگر اس کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کر سکا۔ بظاہر وہ ایک معمولی باپ کا معمولی بچہ تھا۔ نو سال کی عمر تک وہ بالکل عام بچہ دکھائی دیتا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں ایک بار وہ اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس کے استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نااہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ زیورک کے پالی ٹکنیک میں اس کو پہلی بار داخلہ نہ مل سکا کیوں کہ آزمائشی امتحان میں اس کے نمبر بہت کم تھے۔ چنانچہ اس نے مزید تیاری کر کے اگلے سال داخلہ لیا۔ اس کے ایک استاد نے اس کے بارے میں کہا:

Albert was a lazy dog.

البرٹ ایک سست کتا تھا۔ ۲۰ سال کی عمر تک البرٹ آئن شٹائن میں کوئی غیر معمولی آثار نظر نہ آتے تھے۔ مگر اس کے بعد اس نے محنت شروع کی تو وہ اس بلندی تک پہنچا جو موجودہ زمانہ میں بمشکل کسی دوسرے سائنس داں کو حاصل ہوئی۔ اسی بنا پر اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے:

We could take heart that it is not necessary
to be a good student to become Einstein.

ہم کو جاننا چاہئے کہ آئن شٹائن بننے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی طالب علمی کے زمانہ میں ممتاز رہا ہو۔ آئن سٹائن نے اپنی پہلی سائنسی کتاب اس وقت شائع کی جب کہ اس کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اس کے بعد سے اس کی شہرت بڑھتی ہی چلی گئی۔ آئن شٹائن کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ وہ نہایت سادہ غذا کھاتا تھا۔ وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کو اسرائیل کی صدارت پیش کی گئی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیاست انسانیت کا کینسر ہے۔ ۱۹۳۳ میں اس نے ہٹلر کے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص آئن شٹائن کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانہ میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ مگر آئن شٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں پر اتنی قائم ہو چکی تھی کہ کوئی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا (۷ اکتوبر ۱۹۷۹)

تاریخ میں اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے بڑا بچہ پیدا ہونا ضروری نہیں۔ معمولی حیثیت سے آغاز کر کے آدمی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ جدوجہد کی شرطوں کو پورا کرے، بلکہ وہ لوگ زیادہ خوش قسمت ہیں جن کو مشکل مواقع میں زندگی کا ثبوت دینا پڑے۔ کیونکہ مشکل حالات عمل کا محرک ہوتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ نیز زندگی کے بہترین سبق ہمیشہ مشکل حالات میں ملتے ہیں۔ اعلیٰ انسان راحتوں میں نہیں بلکہ مشکلوں میں تیار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں کسی کو اپنے عمل کے لئے معمولی آغاز ملے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ معمولی حالات زندگی کا سب سے مضبوط زینہ ہیں۔ تاریخ کی اکثر اعلیٰ ترین کامیابیاں معمولی حالات کے اندر ہی سے برآمد ہوئی ہیں۔

کیا اس کا کوئی بنانے والا نہیں

آئزک نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے شمسی نظام کی حرکت کے اصول معلوم کئے۔ اس نے شمسی نظام (سورج اور اس کے تابع سیاروں) کا ایک ماڈل بنوایا جو اس کی میز پر رکھا ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک روز نیوٹن کا ایک دوست اس کے کمرہ میں آیا جو خدا کے وجود کو نہیں مانتا تھا۔ میز پر رکھے ہوئے ماڈل کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ نیوٹن کے نظریہ کے مطابق نظام شمسی کا ماڈل ہے۔ تاہم اس کے بنانے والے کا نام اس پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے نیوٹن سے پوچھا: "یہ ماڈل کس نے بنایا ہے"۔ نیوٹن کو یاد آگیا کہ اس کا دوست یہ کہتا ہے کہ یہ دنیا خود سے بن گئی ہے، اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ نیوٹن نے اپنے دوست کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یہ ماڈل خود بخود بن گیا ہے، اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے"۔ دوست بولا "مذاق مت کرو، یہ بتاؤ کہ اتنا اچھا ماڈل کس نے بنایا ہے"۔ نیوٹن نے دوبارہ کہا: "اس کا بنانے والا کوئی نہیں، وہ اپنے آپ بن گیا ہے"۔ دوست نے گھبرا کر کہا: "مذاق چھوڑو، میری بات کا جواب دو کہ اس کو کس کاریگر نے بنایا ہے"۔ آخر نیوٹن نے کہا: "تمھارے اوپر حیرت ہے۔ تم اس بات کو تو بغیر کسی بحث کے مان رہے ہو کہ شمسی نظام کا یہ معمولی سا ماڈل کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنا ہے۔ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ مگر اس معمولی ماڈل کی عظیم اصل (شمسی نظام) کے متعلق تم نے یقین کر لیا ہے کہ وہ اپنے آپ بن گیا ہے، اس کا کوئی بنانے والا نہیں"۔

تلاش کا صحیح جواب نہ پانے کی وجہ سے

ڈاکٹر جے۔ وی۔ نارلیکر (پیدائش ۱۹۳۹) سے ایک انٹرویو میں کہا گیا کہ "مذہبی توہمات" کی پرستش میں سائنس داں دوسرے لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ کتنے سائنس داں دیوتاؤں تک میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں عالمی شہرت کے سائنس داں ڈاکٹر نارلیکر نے جواب دیا: (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ اپریل ۱۹۷۹) مجھے یہ بات بے حد ناپسند ہے۔ عملاً میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے سائنس داں، جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہے ہوتے ہیں تو وہ سائنٹفک نقطۂ نظر کو اپناتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو وہ سائنٹفک طریقہ کا بالکل استعمال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر، مغرب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں جیوتش پر عقیدہ پھیل رہا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ انسان کی اس خواہش نے اس کو جنم دیا ہے کہ وہ آسان اور فوری تسکین کو پالے۔ یہ حقیقۃً ایک ذہنی سہارا ہے"۔

کوئی شخص خواہ جاہل ہو یا عالم، کامیاب ہو یا ناکام، زندگی میں اس کو بار بار ایسے مرحلے پیش آتے ہیں جہاں وہ اپنے عجز کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بے بس وجود ہے۔ یہ چیز اس کو اپنے سے برتر ہستی کی تلاش کی طرف لے جاتی ہے جو اس کی کمیوں کا بدل بن سکے۔ مغرب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، جن کے لئے مادی مواقع کے تمام دروازے کھلے ہوتے ہیں، وہ جب اپنی "ذہنی تسکین" کے لئے مابعد الطبیعاتی عقائد کا سہارا لیتے ہیں تو بااعتبار حقیقت یہ فرضی نہیں ہوتا۔ یہ دراصل اپنی فطرت کی خاموش پکار کا جواب ہوتا ہے۔ اگرچہ اپنی تلاش کا صحیح جواب نہ پانے کی وجہ سے وہ "جیوتش" جیسی توہماتی چیزوں میں اٹک جاتے ہیں ——— خدا کا وجود نہ صرف یقینی ہے بلکہ وہ انسان کے لئے اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔

مجھ پر دولت کی بجلی گری ہے

معمولی حیثیت کا ایک آدمی ترقی کر کے دولت مند بن گیا۔ جب وہ معمولی حیثیت کا تھا تو وہ زیادہ خوش رہتا تھا دولت آنے کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کے ایک پرانے دوست نے پوچھا، یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ پہلے تم ہنستے بولتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارتے تھے۔ اب تم اداس نظر آنے لگے ہو۔ اس نے جواب دیا "میرے اوپر دولت کی بجلی گری ہے"، دولت نے مجھ کو نئے نئے مسائل میں الجھا دیا ہے۔ پہلے ہمارے بچے ہمارے پاس تھے، ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہر بچہ ہم سے دور ہے۔ کوئی یورپ امریکہ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ کوئی دور کے کسی مقام پر ملازم ہے۔ جن بچوں کو پہلے ہم میاں بیوی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہم ان کے سایہ کے لئے بھی ترستے ہیں۔ بھیڑوں کا فارم ہے تو خیال لگا ہوا ہے کہ اتنی قیمتی بھیڑیں ہیں، پتہ نہیں ان کا کیا ہوا۔ ٹرک چل رہے ہیں تو اس کی فکر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ دکانیں ہیں تو ان کی پریشانی کہ ملازم کہیں گڑبڑ نہ کر رہے ہوں۔ غرض جتنی زیادہ دولت ہے اتنی ہی زیادہ فکر ہے، سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس اور طرح طرح کے قانونی جھگڑے اس کے علاوہ ہیں۔ غرض زندگی لطف سے خالی ہو کر بس مسائل اور پیچیدگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جو دولت آدمی کو سکون نہ دے بلکہ بے چین کر دے اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ——— وہ ایک بجلی ہے جو آدمی کے اوپر گر پڑی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوشی کا کوئی تعلق دولت یا دنیوی اعزازات سے نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سب کچھ پا کر بھی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ ایک امریکی مصنفہ کٹی کیلی نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے: آہ جیکی۔ یہ جیکولین کینیڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کہ کسی وقت امریکہ کی خاتون اول تھی۔ جیکولین قدرت سے ایک پرکشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی شادی جان کینیڈی سے ہوئی جو بعد کو امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۳ کو جب صدر کینیڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تو اس وقت جیکولین کینیڈی دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے یونانی ارب پتی اوناسس سے شادی کی۔ یہ شادی میاں بیوی دونوں کے لئے خوش گوار ثابت نہ ہو سکی یہاں تک کہ ۱۹۶۸ میں اوناسس کا انتقال اس وقت ہو گیا جب کہ جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔

جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ مصنفہ کے الفاظ میں، جیکولین نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی ناقابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا خواہ اس کی قیمت تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کر سکی:

---AN INCURABLE DESIRE TO BUY HAPPINESS, EVEN IF IT MEANT SPENDING AS MUCH IN ONE HOUR AS 3000 DOLLARS.
Jackie Oh: An Intimate Biography,
By Kitty Kelley, Vikas, New Delhi, 1979, pp. 336

کچھ الفاظ بول دینے کا نام دلیل نہیں

حق کی دعوت آدمی کے سامنے آتی ہے۔ وہ اس کے خلاف ایک بات کہتا ہے۔ بظاہر وہ ایک دلیل دے رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ کج بحثی ہوتی ہے۔ اسی کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ یہ بات جو انھوں نے کہی، یہ تم سے جھگڑنے کے لئے کہی ہے۔ یہ زخرف ۵۸ صرف جھگڑالو لوگ ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخاطبین کو یہ آیت سنائی: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہوں گے) عبداللہ بن زبعری نے یہ سن کر کہا: جس طرح ہم بتوں کو پوجتے ہیں، اسی طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں اور تم خود اپنے عقیدہ کے مطابق ان کو رسول مانتے ہو۔ پھر ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں اگر ہمارے بتوں کا وہی انجام ہو جو تمھارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ کا ہوگا"۔ اس کے بعد حاضرین نے اس ذہانت کی داد اس طرح دی کہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: لیس احدٌ یُعبَد من دون اللّٰہ فیہ خیر (اللہ کے سوا جس کو معبود بنایا جائے اس میں کوئی خیر نہیں) مخالفین نے کہا: کیا مسیح میں بھی کوئی خیر اور بھلائی نہیں۔ کیوں کہ ان کو بھی بنانے والوں نے خدا کے سوا معبود بنا لیا ہے"۔ اس قسم کی باتوں کو قرآن میں الغارفی الکلام (حم سجدہ ۲۶) کہا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سیدھی بات سے "برا مفہوم" نکالا جائے۔ والغوا فیہ کی تفسیر میں ضحاک نے عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کے کلام میں عیب نکالو (عیبوہ، تفسیر ابن کثیر)

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلہ کا علمی تجزیہ کیا جائے۔ آسمانی علم یا مسلمہ حقائق کی روشنی میں ان کا غلط ہونا واضح کیا جائے۔ یہ صحیح تنقید ہے اور اس کی اجازت ہر ایک کو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ کا عقلی یا نقلی تجزیہ کرنے کے بجائے اس میں عیب لگائے جائیں۔ یہ دوسرا طریقہ نہ صرف غلط ہے بلکہ گناہ بھی ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ اسلام کا ثبت اور مستقل کام دعوت ہے نہ کہ جدال و قتال۔ البتہ اگر مخالف طاقتیں حملہ آور ہوں تو مخصوص شرائط کے تحت اس کا دفاع میدان جنگ میں کیا جائے گا۔ کسی کو اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہو تو دلائل کی زبان میں وہ اس کو رد کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اختلاف کرنے والا یہ کرے کہ جو شخص اس نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے اس کو "قادیانی" یا "صہیونی ایجنٹ" کہنے لگے تو یہ کلام میں عیب لگانے کی مثال ہوگی جو نہ صرف علمی اعتبار سے بے معنی ہے بلکہ اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔ قرآن اور حدیث کی مذکورہ بالا مثال سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام خواہ کتنا ہی حق ہو، ایک آدمی جو بات کو سمجھنا نہ چاہتا ہو، وہ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ ڈھونڈے گا جس کی بنیاد پر وہ اس کلام کو بے اعتبار ظاہر کر سکے۔ کلام میں ایسا کوئی "نکتہ" پاکر آدمی کو کبھی اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہئے کہ وہ اپنے حق میں کوئی مضبوط دلیل پا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو وہ دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک جدال ہو جس کی کوئی قیمت نہ علم کی نظر میں ہو اور نہ اللہ کی نظر میں۔

یہ خوش خیال مفکرین

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ ـ ۱۸۷۷) ایک آفاقی شاعر تھے۔ نہ صرف چین و عرب بلکہ سارا جہان ان کا وطن تھا۔ ان کا سبق تھا: زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز (زمانہ اگر تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے لڑ کر زمانہ کو اپنے موافق بناؤ) انھوں نے مسلمانوں کو اس قسم کے تحفے دیے:

کافر کی یہ تعریف کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ تعریف کہ گم اس میں ہیں آفاق

مگر یہی اقبال تھے جنھوں نے ۱۹۳۱ میں ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ شاعری کی دنیا میں اقبال سارے آفاق کو اپنے اندر گم کئے ہوئے تھے۔ مگر عمل کی دنیا میں وہ پوری زمین تو درکنار ایک ملک کو بھی اپنے اندر گم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ وہ ملک کے کنارے ایک ایسا چھوٹا ٹکڑا حاصل کرنے پر قانع ہو گئے جہاں مسلمان پہلے سے اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب ہوں۔ وہ شخص جو شاعری کی سطح پر "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کا ترانہ گا رہا تھا وہ عمل کی سطح پر ملک کے اکثریتی فرقہ کو بھی اپنے اندر ضم کرنے کا منصوبہ نہ بنا سکا۔ اس سے نجات کی صورت اس کی سمجھ میں صرف یہ آئی کہ بٹوارہ کرکے اپنے لئے علیحدگی کا ایک گوشہ تلاش کرلے ـــــــ یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان مفکرین اور مصلحین کا حال نظر آتا ہے۔ تقریر اور تحریر میں ان کی منزل چرخ نیلی فام سے بھی پرے ہوتی ہے۔ الفاظ کی دنیا میں آسمان کے ستارے بھی ان کی گرد راہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر آتے ہی ان کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ایک پھولا ہوا غبارہ تھا جو واقعات کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گیا۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ ـ ۱۸۷۸) عالمی اسلامی خلافت کے لئے اٹھے۔ ان کی شان دار اسلامی تقریروں سے ایک پورا براعظم گونج اٹھا۔ شعری فضاؤں میں وہ "یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے" کی سطح پر پرواز کر رہے تھے۔ مگر ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۱ میں خلافت کا ادارہ ختم کر دیا تو ان کی قیادت بے زمین ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ان کے لئے کرنے کا کام اس کے سوا کچھ اور نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ایک مشترک وطن کی آزادی پر قربان کر دیں۔ جو شخص عالمی اسلامی خلافت پر جان دینے کے لئے اٹھا تھا اس نے ایک ایسی وطنی آزادی پر جان دینا پسند کر لیا جو عملاً مسلم اقلیت کے اوپر غیر مسلم اکثریت کے غلبہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اسلامی خلافت کا مینار گاندھیائی خلافت کی بنیاد کی ایک اینٹ بن کر رہ گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ ـ ۱۸۸۸) نے اپنی زندگی کا آغاز الہلال اور البلاغ کی پرشور تحریروں اور مسلم اجتماعات میں اپنی عالی شان تقریروں سے کیا۔ اس وقت وہ قرآن سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ انھوں نے "پیغمبرانہ زبان" میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ خدا کی کتاب لے کر اٹھیں اور خیر الامم کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سارے عالم کے لئے آفتاب و ماہتاب بن جائیں۔ مگر قرآنی انقلاب کا پیغام دینے والا بالآخر ہندستانی قومیت کا پیغام دینے والا بن گیا۔ وہ شخص جس نے "حزب اللہ" کے قیام کو اپنا مقصد بنایا تھا وہ حزب الوطن کی سطح پر آکر ٹھہر گیا۔ ۱۹۴۷ میں ان کی دعوت پر سارے ملک کے مسلمان لکھنؤ کنونشن میں جمع ہو گئے۔ مگر اس نازک تاریخی موڑ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ہندستانی مسلمانوں کے لئے جو پیغام تھا وہ صرف یہ کہ ـــــــ سارے مسلمان انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ - ۱۹۰۳) کی مثال اور بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد حاکمیت خدا پر رکھی۔ انھوں نے کہا کہ زمین پر صرف خدا کے قانون کی حکمرانی قائم ہونی چاہئے۔ اس کے سوا جتنے قانون انسان نے بنائے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ مسلمان کے لئے ایسی زندگی حرام ہے جب کہ وہ غیر خدائی قانون پر راضی ہو جائے۔ اس کو یا تو خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے یا اس کے نفاذ کے لئے لڑتے ہوئے مر جانا ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون - - - ھم الفاسقون - - ھم الظالمون (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا تھا کہ غیر خدائی قانون کو بنانے والا قانون ساز، اس کے تحت فیصلہ کرنے والا جج، اس کو نافذ کرنے والی حکومت، سب کے سب فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک شخص مسئلہ طور پر مجرم ہو اور اس کو انسانی قانون کے تحت سزا دی جائے تب بھی وہ جرم کی سزا نہیں ہوتی بلکہ خود ایک جرم ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی زمین پر کسی کو یہ طے کرنے کا حق نہیں کہ کسی جرم پر کسی کو کیا سزا دی جائے نہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بطور خود کسی سزا کو نافذ کرے۔ گویا کہ وہ شخص جو انسانی قانون کے تحت ایک قاتل کو قتل کرتا ہے وہ خود بھی ایک قاتل ہے۔ کیوں کہ اس نے خدا کی زمین پر خدا کی اجازت کے بغیر خدا کی پیدا کی ہوئی ایک جان کو ہلاک کیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ساری عمر قانون اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے۔ عمر کے آخری حصہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو پاکستان میں فوجی انقلاب آیا اور جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم ہو گئی جس کو نہ صرف مولانا مودودی کی مکمل تائید حاصل تھی بلکہ ان کی اپنی جماعت کے کئی افراد اس میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے۔ اس حکومت کے تحت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چلایا گیا جو خود مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے مطالبہ "پہلے احتساب پھر انتخاب" کے مطابق تھا۔ ان کے لئے پورا موقع تھا کہ وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو شرعی قانون کی عدالت میں کھڑا کریں اور اسلامی احکام کے مطابق ان پر باقاعدہ مقدمہ چلائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ساری دنیا کے سامنے اسلام کی وہ "عملی شہادت" پیش کر دیتے جس کے وہ زندگی بھر مبلغ رہے تھے اور جس کے بغیر ان کے نزدیک دعوت اسلامی کا کام مکمل نہیں ہوتا — مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی پوری جماعت کی مکمل تائید و حمایت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلایا گیا۔ پاکستان میں اس وقت تین قسم کی عدالتیں ہیں۔ ایک فوجی عدالت، دوسرے شرعی عدالت، تیسرے برطانوی قانون کے تحت قائم شدہ عدالت جو تقسیم کے پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ وہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ کو شرعی عدالت میں جاری کرا سکتے تھے۔ بالفرض اگر شرعی عدالتوں کے اختیارات محدود ہوں تو صدارتی فرمان کے ذریعہ اس کے اختیار کو وسیع بنا کر اور حسب ضرورت قاضیوں کا تقرر کر کے یہ کام عمل میں آ سکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ مولانا مودودی یا ان کی جماعت کے کسی شخص نے اس کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ مسٹر بھٹو کا مقدمہ، شرعی عدالت کو چھوڑ کر، اس عدالت کے زیر سماعت لایا گیا جو برطانوی قانون پر مبنی چلی آ رہی ہے۔ مسٹر بھٹو پر قتل کا الزام تھا جس کے لئے واضح قوانین اسلامی شریعت میں موجود ہیں۔ مگر ان کا مقدمہ جانتے بوجھتے برطانی قانون تعزیرات کے تحت چلایا گیا نہ کہ اسلامی قانون تعزیرات کے تحت۔

پاکستان کا یہ مشہور ترین مقدمہ مولانا مودودی کی مکمل تائید و حمایت کے تحت چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو

مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی جب کہ مولانا مودودی زندہ سلامت موجود تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریہ کے مطابق یہ ساری کارروائی تحاکم الی الطاغوت (اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے اس حاکم کے پاس جانا جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو) کی مصداق تھی۔ وہ مکمل طور پر غیر اسلامی تھی کیوں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت عمل میں لائی گئی۔ مگر مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کی پوری تائید کرتے رہے۔ وہ شخص جس نے اس عنوان سے شہرت پائی کہ وہ اس اصول کا سب سے بڑا مبلغ ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلہ کرنا کفر اور ظلم اور فسق ہے، یہ طاغوتی عدالت کے پاس اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے جانا ہے جو سراسر ایمان کے منافی ہے۔ جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لئے کسی طرح راضی نہ تھا۔ اس نے خود اپنے اختیار سے اس اصول کو دفن کر دیا۔ اس نے اپنی پوری تائید اور اہتمام کے ساتھ غیر خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ایک مشہور ترین "مجرم" پر مقدمہ چلوایا اور اسی غیر خدائی قانون کے مطابق اس شخص کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ وہ شخص جو ساری عمر خدائی قانون کے نفاذ کی تحریک چلاتا رہا، پہلا موقع ملتے ہی اس نے اپنے عمل سے یہ گواہی دی کہ ملک کے لئے یا کم از کم اس کے اپنے مقصد کے لئے سب سے زیادہ کارآمد قانون وہ ہے جو انسان کا بنایا ہوا ہے ——— موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے بڑی بڑی اسلامی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر وہ اپنی تحریک کی آپ تردید کرتے رہے۔ پھر جو لوگ اپنی تردید آپ کریں وہ اپنے باہر کس طرح اس کو نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ وہ شاندار کامیابی حاصل کرنے کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں اسلام پسند مفکرین کا کہنا تھا کہ ملک کے ۹۹ فی صد لوگ اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ صرف بھٹو جیسے چند لوگ ہیں جو اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر ان تھوڑے سے لوگوں کو میدان سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بعد عوامی انتخاب ہو تو سارے لوگ اسلام کو ووٹ دیں گے اور اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسری چیز قائم نہ ہو سکے گی۔ بے شمار ناقابل بیان قربانیوں کے بعد "بھٹوؤں" کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی مفکرین کے پسندیدہ حکمراں جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ کو پاکستان میں عام الکشن کرائیں گے۔ پھر اس کو ملتوی کر کے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ کی تاریخ الکشن کے لئے مقرر کی گئی جو دوبارہ منسوخ کر دی گئی۔ دونوں بار جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ چوں کہ "مثبت نتائج" کی امید نہیں اس لئے الکشن ملتوی کئے جاتے ہیں۔ "بھٹوؤں" کے خاتمہ پر پاکستان کے اسلام پسند عام الفتح (۱۹۷۷) منا چکے تھے۔ مگر جب انتخاب کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ عوامی رائے کے ذریعہ ان کے لئے اقتدار پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ابتدائی اندازہ کرنے کے لئے ملک میں بلدیاتی الیکشن (ستمبر ۱۹۷۹) کرایا گیا۔ مگر ہر قسم کی پابندیوں کے باوجود "بھٹو پارٹی" نے ۸۰ فی صد نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد عام انتخابات کا منصوبہ مستقل طور پر ختم کر دیا گیا۔ شاندار فتح حاصل کرنے کے باوجود صرف شاندار ناکامی اسلام پسندوں کے حصہ میں آسکی۔ اب پاکستان میں جو "اسلام پسند" حکومت قائم ہے وہ صرف جبر کے زور پر قائم ہے نہ کہ عوامی تائید کے زور پر۔

اب ایران کی مثال لیجئے۔ شاہ محمد رضا پہلوی نے جب جنوری ۱۹۷۹ میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ملک کو چھوڑا اور فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ روح اللہ خمینی فاتحانہ انداز سے تہران کے ہوائی اڈہ پر اترے تو اسلام پسندوں نے اس کو ایسا انقلاب قرار دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے باوجود ایران کو نئے انقلاب نے

جو کچھ دیا وہ صرف وحشت و بربریت تھی۔ ایران کے عوام کو اسلام کی برکتوں کا کوئی تجربہ نہ ہوسکا۔ اٹلی کی ایک صحافی خاتون اوریانا فلاسی (Oriana Fallaci) نے اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا دورہ کیا اور ایران کے مطلق حکمراں آیات اللہ روح اللہ خمینی کا انٹرویو لیا۔ خاتون نے موصوف سے پوچھا "میں نے ایران کے دورہ میں دیکھا کہ یہاں اسلامی انقلاب کے نتائج سے لوگ بہت غیر مطمئن ہیں۔ ہر طرف انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے اسلامی انقلاب کا وہ پھل لوگوں کو نہیں ملا جس کا ان سے انقلاب سے پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ یہاں کچھ لوگ ہیں جو اندیشہ کر رہے ہیں کہ ایران کے لئے بہت مشکل ایام آنے والے ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے" آیات اللہ خمینی جن کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے، اس کے جواب میں کہتے ہیں: "ہم اس بچہ کی طرح ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ ماہ ہے۔ ہمارے اسلامی انقلاب کی عمر صرف چھ مہینے ہے۔ ہم اپنے سفر کے آغاز میں ہیں۔ آپ ایسے بچے سے کیا امید کر سکتی ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ مہینے ہو" (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ نومبر ۱۹۷۹)

ایران کے اسلامی لیڈر کا یہ جواب صرف اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا انقلاب شان دار کامیابی کے باوجود صرف شاندار ناکامی تک پہنچا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک "بچہ" ہوتی ہے، انقلاب کبھی بچہ "نہیں ہوتا۔ انقلاب تو کسی تحریک کے کمس عمر کو پہنچنے کا نام ہے۔ پھر وہ بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ انقلاب جو انقلاب کے مرحلہ میں پہنچ کر بچہ ہو وہ انقلاب ہی نہیں۔ وہ صرف ایک ہڑبونگ ہے جس کو غلطی سے انقلاب کا نام دے دیا گیا ہے —— یہی وجہ ہے کہ الٰہی خلافت کے نام پر اٹھنے والے جب اقتدار پاتے ہیں تو فوراً انسانی آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ملک کے مایوس اور ناراض عوام کے درمیان اپنی زندگی کی کوئی صورت انھیں آمریت کے سوا نظر نہیں آتی۔ "اسلامی نظام" قائم کرنے کے دعوے دار بالآخر "غیر اسلامی نظام" قائم کر کے اس کے سایہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے انتہائی بڑے بڑے اسلامی مفکرین و مصلحین کا یہ عبرت ناک انجام کیوں ہوا۔ اس کے اسباب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ایک مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مفکرین دراصل رومانی مفکرین تھے نہ کہ حقیقت پسند مفکرین، اور رومانی دنیا میں جو خیالی محل بنایا گیا ہو وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی واقعی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ رومانویت (Romanticism) جو اٹھارویں صدی سے لے کر جنگ عظیم اول تک ایک خاص صورت میں یورپ میں پائی جاتی تھی، وہی انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلم مفکرین پر اپنے حالات کے لحاظ سے چھائی رہی ہے۔ ہر قوم جس کا ایک شان دار ماضی ہو اور پھر وہ زوال کا شکار ہو جائے، اس کے بعد جب اس کے درمیان احیاء نو کی تحریک اٹھتی ہے تو اس میں خوش خیال مفکرین کثرت سے جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنے تصوراتی ماضی کے زیر اثر اپنے مستقبل کے بارے میں حسین خواب دیکھتے ہیں جو ہمیشہ مبالغہ آمیز حد تک خیالی ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں کوئی واقعہ پیدا کرنے کے لئے لمبا وقت اور خشک عمل درکار ہوتا ہے۔ جب کہ خیالی دنیا میں شان دار قلعہ کھڑا کرنے کے لئے الفاظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ماضی اور مستقبل کے درمیانی فاصلہ کو طے کرنے کے لئے الفاظ کے بڑے بڑے پل بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے دور میں حقیقت پسندانہ بات کرنے والے کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ البتہ آنے والے مستقبل کا جو شخص جتنا زیادہ مبالغہ آمیز نقشہ دکھائے اتنا ہی زیادہ وہ عوام میں مقبول ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام مفکرین خوش خیالیوں کا محل کھڑا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور جس کا

فرضی محل جتنا زیادہ شان دار ہو اتنا ہی زیادہ بھیڑ اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بھیڑ تخریبی نوعیت کا کوئی "انقلاب" برپا کرنے میں ممکن ہے کامیاب ہو جائے۔ مگر وہ تعمیری نوعیت کا انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تخریبی انقلاب کے لئے تو کسی "بھٹو" یا کسی "شاہ رضا" کا للکا گھونٹ دینا کافی ہے۔ مگر تعمیری انقلاب کے لئے "مارنا" نہیں بلکہ "زندہ کرنا" پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہوش درکار ہے نہ کہ جوش۔ اس کے لئے حقیقت پسندی درکار ہے نہ کہ خوش خیالی۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی خاموش جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے مثبت عوامل درکار ہوتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے مطابق حقائق و واقعات کی زمین فراہم کی جائے۔ مگر یہ وہ چیزیں ہیں جو خوش خیال مفکرین کے یہاں سرے سے موجود نہیں ہوتیں۔ ان کا سرمایہ ہوتا ہے — غلو، لفاظی، خیال آرائی، شاعرانہ بلند پروازی۔ اور ظاہر ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کا خیالی محل اپنے لئے حقیقی زمین نہ پاکر اچانک منہدم ہو جاتا ہے۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ زمانہ کے ان اسلامی مفکرین و مصلحین نے کوئی مفید کام نہیں کیا۔ ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ مفید پہلو ہوتے ہیں اور ان کی تحریکوں کے دوران بھی بلاشبہ کئی مفید کام انجام پائے۔ مگر یہ تحریکیں مجموعی طور پر اثمهما اكبر من نفعهما (ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے) کا مصداق تھیں۔ اور سب سے بڑا نقصان جو ان تحریکوں کے ذریعہ امت مسلمہ کو پہنچا وہ ذہنی بگاڑ تھا۔ یہ براہ راست طور پر انھیں تحریکوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ جذباتی اور غیر حقیقت پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی تحریک جو انسانی معاشرہ میں اٹھے، ضروری نہیں کہ وہ اپنے مقررہ عملی نشانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ تاہم عملی نتیجہ نہ پیدا کرکے بھی وہ ایک نتیجہ لازماً پیدا کرتی ہے، اور وہ فکری نتیجہ ہے۔ ہر تحریک کم از کم اپنے متاثر ہونے والوں میں، سوچنے کا ایک ڈھنگ، رائے قائم کرنے کا ایک طریقہ، معاملات کے بارے میں فیصلہ کا ایک ذہن دیتی ہے۔ اس لئے کسی تحریک کی قدر و قیمت کو اس اعتبار سے متعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عملی طور پر اپنی مقررہ منزل تک پہنچی یا نہیں۔ بلکہ کسی تحریک کی قدر و قیمت کو جانچنے کا اصلی معیار یہ ہے کہ اس نے جن افراد کو متاثر کیا ان کے اندر اس نے کس قسم کا فکری مزاج پیدا کیا۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کے مزاج کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین و مصلحین کا ایک طبقہ وہ ہے جس کا تمام تر سرمایہ بڑے بڑے الفاظ تھے۔ اس نے شاعرانہ ترنگوں، جوشیلی تقریروں اور خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ اپنی تحریکیں چلائیں۔ الفاظ کے زور پر واقعات برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان تحریکوں نے قوم کے افراد کو صرف جذباتی بنانے میں مدد دی۔ لوگ الفاظ کو واقعہ کا بدل سمجھنے لگے۔ حقیقت پسندانہ طرز فکر ان سے رخصت ہو گیا۔ خیال آرائیوں سے وہ اس نتیجہ کی امید کرنے لگے جو اس دنیا میں صرف حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ مفکرین تھے جو خود بھی غلو کا شکار ہوئے اور اپنے افکار سے دوسرے بہت سے لوگوں کو غلو کا شکار کیا۔ وہ سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ ملت کا مستقبل برآمد کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی غلو پسندی صرف سیاسی عمل پر قانع نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے سیاسی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے پورا سیاسی فلسفہ بنایا، حتی کہ خود قرآن و اسلام کو سیاسی بناڈالا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے ان کے لئے خدا کا دین ایک قسم کا سیاسی نظریہ بن کر رہ گیا۔ وہ بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے مکمل اسلام کو پالیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جس اسلام کو پایا اس میں سب کچھ تھا مگر وہی چیز نہ تھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے ——— تعلق باللہ اور خوف آخرت۔

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں حجت کی۔ کیوں کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ وہ بولا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تم اس کو پچھم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا

۲۵۸

موجودہ زمانہ میں عوامی تائید سے حکومت کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ مگر جمہوریت کے دور سے پہلے اکثر بادشاہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ خدا کا انسانی پیکر ہیں۔ قدیم عراق کے بادشاہ نمرود کا معاملہ یہی تھا جو حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ اس کی قوم سورج کو دیوتاؤں کا سردار مانتی تھی۔ اور اس کی پوجا کرتی تھی۔ نمرود نے کہا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ لوگوں کے اوپر حکومت کرنے کا خدائی حق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس وقت کے عراق میں جب توحید کی آواز بلند کی تو اس کا سیاست و حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ لوگوں سے صرف یہ کہہ رہے تھے کہ تمھارا خالق اور مالک صرف ایک اللہ ہے۔ کوئی نہیں جو خدائی میں اس کا شریک ہو۔ اس لئے تم اسی کی عبادت کرو۔ اسی سے ڈرو اور اسی سے امیدیں قائم کرو۔ تاہم اس غیر سیاسی دعوت میں نمرود کو اپنی سیاست پر زد پڑتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا عقیدہ جس میں سورج کو ایک بے زور بندہ بتایا گیا ہو وہ گویا اس اعتقادی بنیاد ہی کو ڈھا رہا تھا جس کے اوپر نمرود نے اپنا سیاسی تخت بچھا رکھا تھا۔ اس وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے نمرود سے جو گفتگو کی اس سے اخبار کا طریق دعوت معلوم ہوتا ہے۔ نمرود کے سوال کے جواب میں آنجناب نے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ نمرود نے مناظرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ موت اور زندگی پر تو میں بھی اختیار رکھتا ہوں۔ جس کو چاہوں مردادوں اور جس کو چاہوں زندہ رہنے دوں۔ آنجناب نمرود کا جواب دے سکتے تھے۔ مگر آپ نے گفتگو کو مناظرہ بنانا پسند نہ کیا، اس لئے آپ نے فوراً دوسری مثال پیش کر دی جس کے جواب میں نمرود اس قسم کی بات نہ کہہ سکتا تھا جو اس نے پہلی مثال کے جواب میں کہی۔ حضرت ابراہیم کے لئے نمرود حریف نہ تھا بلکہ مدعو کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ استدلال کا کون سا حکیمانہ انداز ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے اس کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز کو آدمی دو مختلف معنوں میں لے سکے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دولت اور اقتدار آجائے تو وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھ سکتا ہے کہ اس کی کامیابی اس کو اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ نظر آئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھے کہ اس کو محسوس ہو کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ سراسر خدا کا انعام ہے۔ پہلی صورت ظلم کی صورت ہے اور دوسری شکر کی صورت۔ جس شخص کے اندر ظالمانہ مزاج ہو اس کے لئے موجودہ دنیا صرف گمراہی کی خوراک ہوگی۔ اس کو ہر واقعہ میں گھمنڈ اور خود پسندی کی غذا ملے گی۔ اس کے برعکس جس کے اندر شکر کا مزاج ہوگا، اس کے لئے ہر واقعہ میں ہدایت کا سامان ہوگا۔ خدا کی دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کے لئے رزق ایمانی کا دسترخوان بن جائے گی۔

یا جیسے وہ شخص جس کا گزر ایک بستی پر سے ہوا۔ اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔ اس نے کہا: ہلاک ہو جانے کے بعد اللہ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا۔ پھر اللہ نے اس پر سو برس تک کے لئے موت طاری کر دی۔ پھر اس کو اٹھایا۔ اللہ نے پوچھا تم کتنی دیر اس حالت میں رہے۔ اس نے کہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم۔ اللہ نے کہا نہیں بلکہ تم سو برس رہے ہو۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ سڑی نہیں ہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو۔ اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیں۔ اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر واضح ہو گیا تو کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھ کو دکھا دے کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ اللہ نے کہا، کیا تم نے یقین نہیں کیا۔ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں، مگر اس لئے کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے۔ فرمایا تم چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ پہاڑی پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے ۲۵۹-۶۰

یہاں موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کے جن دو تجربات کا ذکر ہے ان کا تعلق انبیاء سے ہے۔ پہلا تجربہ غالباً حضرت عزیرؑ کے ساتھ گزرا جن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اور دوسرا تجربہ حضرت ابراہیمؑ سے تعلق رکھتا ہے جن کا زمانہ ۱۹۸۵ — ۲۱۶۰ ق م کے درمیان ہے۔ انبیاء خدا کی طرف سے اس لئے مقرر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو غیبی حقائق سے باخبر کریں، اس لئے ان کو وہ غیبی چیزیں بے پردہ کر کے دکھا دی جاتی ہیں جن پر دوسروں کے لئے اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ انبیاء کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ وہ ان چیزوں کے ذاتی مشاہدہ کر ان کی بابت لوگوں کو باخبر کر سکیں۔ وہ لوگوں کو جن غیبی حقیقتوں کی خبر دیں ان کے متعلق کہہ سکیں کہ ہم ایک دیکھی ہوئی چیز سے تم کو خبردار کر رہے ہیں نہ کہ محض سنی ہوئی چیز سے۔

انبیاء کو چالیس سال کی عمر میں نبوت دی جاتی ہے۔ نبوت سے پہلے ان کی پوری زندگی لوگوں کے سامنے اس طرح گزرتی ہے کہ ان سے کسی شخص کو جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تقریباً نصف صدی تک ماحول کے اندر اپنے سچے ہونے کا ثبوت دینے کے بعد وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کے سامنے ان غیبی حقیقتوں کے اعلان کے لئے کھڑا کرے جن کو آزمائش کی مصلحت کی بنا پر لوگوں سے چھپا دیا گیا ہے۔ ماحول کے یہ سب سے زیادہ سچے لوگ ایک طرف اپنے مشاہدہ سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف عقل اور فطرت کے شواہد سے اس کو مدلل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ انبیاء کو ہمیشہ شدید ترین حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے قول سے پھرتے نہیں وہ انتہائی ثابت قدمی کے ساتھ اپنی بات پر جمے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ فرضی طور پر انھوں نے کوئی بات نہیں گھڑ لی ہے۔ کیوں کہ گھڑی ہوئی بات کو پیش کرنے والا بھی اتنے سخت حالات میں اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اس کی بات خارجی کائنات سے اتنا زیادہ مطابق ہو سکتی ہے کہ وہ سراپا اس کی تصدیق بن جائے۔

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جس سے سات بالیں پیدا ہوں، ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔ اور اللہ بے نیاز ہے، تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو احسان رکھ کر اور ستا کر اپنے صدقہ کو ضائع نہ کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینھ پڑے اور اس کو بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کچھ بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ اور اللہ منکروں کو راہ نہیں دکھاتا ۲۶۱—۲۶۴

ہر عمل جو آدمی کرتا ہے وہ گویا ایک بیج ہے جو آدمی "زمین" میں ڈالتا ہے۔ اگر اس کا عمل اس لئے تھا کہ لوگ اسے دیکھیں تو اس نے اپنا بیج دنیا کی زمین میں ڈالا تاکہ یہاں کی زندگی میں اپنے کئے کا پھل پا سکے۔ اور اگر اس کا عمل اس لئے تھا کہ اللہ اس کو "دیکھے" تو اس نے آخرت کی زمین میں اپنا بیج ڈالا جو اگلی دنیا میں اپنے پھول اور پھل کی بہاریں دکھائے۔ دنیا میں ایک دانہ سے ہزار دانے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال آخرت کے کھیت میں دانہ ڈالنے کا بھی ہے۔

دنیا کے فائدہ یا دنیا کی شہرت و عزت کے لئے خرچ کرنے والا اسی دنیا میں اپنا معاوضہ لینا چاہتا ہے۔ ایسے آدمی کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ مگر جو شخص اللہ کے لئے خرچ کرے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی پر احسان نہیں جتاتا، اس نے جب اللہ کے لئے خرچ کیا ہے تو انسان پر اس کا کیا احسان۔ اس کی رقم خرچ ہو کر جن لوگوں تک پہنچتی ہے ان کی طرف سے اس کو اچھا جواب نہ ملے تو وہ ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کو تو اچھا جواب اللہ سے لینا ہے، پھر انسانوں سے ملنے یا نہ ملنے کا اسے کیا غم۔ اگر کسی سائل کو وہ نہیں دے سکتا تو وہ اس سے برا کلمہ نہیں کہتا۔ بلکہ نرمی کے ساتھ معذرت کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ بول رہا ہے خدا کے سامنے بول رہا ہے۔ خدا کا خوف اس کو انسان کے سامنے زبان روکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پتھر کی چٹان کے اوپر کچھ مٹی جم جائے تو بظاہر وہ مٹی دکھائی دے گی۔ مگر بارش کا جھونکا آتے ہی مٹی کی اوپری تہ بہہ جائے گی اور اندر سے خالی پتھر نکل آئے گا۔ ایسا ہی حال اس انسان کا ہوتا ہے جو بس اوپری دین داری لئے ہوئے ہو۔ دین اس کے اندر تک داخل نہ ہوا ہو۔ ایسے آدمی سے اگر کوئی سائل بے ڈھنگے انداز سے سوال کر دے یا کسی کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے آجائے جو اس کی انا پر ضرب لگانے والی ہو تو وہ بپھر کر انصاف کی حدوں کو توڑ دیتا ہے۔ ایسا ایک واقعہ ایک ایسا طوفان بن جاتا ہے جو اس کی اوپری "مٹی" کو بہائے جاتا ہے، اور پھر اس کا اندر کا انسان سامنے آجاتا ہے جس کو وہ دین کے ظاہری لبادہ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا ——— اللہ کے لئے عمل کرنا گویا دیکھے پر ان دیکھے کو ترجیح دینا ہے۔ جو اس بلند نظری کا ثبوت دے وہی وہ شخص ہے جس پر خدا کی چھپی ہوئی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو اللہ کی رضا چاہنے کے لئے اور اپنے نفس میں پختگی کے لئے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی طرح ہے جو بلندی پر ہو۔ اس پر زور کا مینھ پڑا تو وہ دونا پھل لایا۔ اور اگر زور کا مینھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی کافی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ تب اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ ہو۔ پھر وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح تمہارے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو ۲۶۶ — ۲۶۵

آدمی جب کسی چیز کے لئے عمل کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کے حق میں اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی خواہش کے تحت عمل کرے تو اس نے اپنے دل کو اپنی خواہش پر جمایا۔ اس کے برعکس آدمی اگر وہاں عمل کرے جہاں خدا چاہتا ہے کہ عمل کیا جائے تو اس نے اپنے دل کو خدا پر جمایا۔ دونوں راہوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی آسان حالات میں عمل کرنا ہوتا ہے اور کبھی مشکل حالات میں۔ تاہم مواقع جتنے شدید ہوں، آدمی کو جتنا زیادہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا عمل کرنا پڑے اتنا ہی زیادہ وہ اپنے پیش نظر مقصد کے حق میں اپنے ارادہ کو مستحکم کرے گا۔ عام حالات میں اللہ کی راہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے۔ مگر جب مخالف اسباب کی وجہ سے خصوصی قوت ارادی کو استعمال کر کے آدمی اللہ کی راہ میں اپنا اثاثہ دے تو اس کا ثواب اللہ کے یہاں بہت زیادہ ہے ——— جس مد میں خرچ کرنا دنیوی اعتبار سے بے فائدہ ہو اس میں اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا، جس کو دینے کا دل نہ چاہے اس کو اللہ کے لئے دینا، جس سے خوش معاملگی پر طبیعت آمادہ نہ ہو اس سے اللہ کی خاطر خوش معاملگی کرنا، وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو سب سے زیادہ خدا پرستی پر جماتی ہیں اور اس کو خدا کی خصوصی رحمت و نصرت کا مستحق بناتی ہیں۔

آدمی جوانی کی عمر میں باغ لگاتا ہے تاکہ بڑھاپے کی عمر میں اس کا پھل کھائے۔ پھر وہ شخص کیسا بدنصیب ہے جس کا ہرا بھرا باغ اس کی آخر عمر میں عین اس وقت برباد ہو جائے جب کہ وہ سب سے زیادہ اس کا محتاج ہو اور اس کے لئے وہ وقت بھی ختم ہو چکا ہو جب کہ وہ دوبارہ نیا باغ لگائے اور اس کو از سر نو تیار کرے۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا ہے جنھوں نے دین کا کام دنیوی عزت و منفعت کے لئے کیا۔ وہ بظاہر نیکی اور بھلائی کا کام کرتے رہے۔ مگر ان کا کام صرف شکلاً ہی عام دنیا داروں سے مختلف تھا۔ باعتبار حقیقت دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ عام دنیا دار جس دنیوی ترقی اور ناموری کے لئے دنیوی نقشوں میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے، اسی دنیوی ترقی اور ناموری کے لئے انھوں نے دینی نقشوں میں دوڑ دھوپ جاری کر دی۔ جو شہرت و عزت دوسرے لوگ دنیا کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کر کے حاصل کر رہے تھے، اسی شہرت و عزت کو انھوں نے دین کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کر کے حاصل کرنا چاہا۔ ایسے لوگ جب مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں ان کے لئے کچھ نہ ہوگا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اسی دنیا کے لئے کیا۔ پھر وہ اپنے کئے کا پھل اگلی دنیا میں کس طرح پا سکتے ہیں ——— خدا کی نشانیاں ہمیشہ ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر وہ خاموش زبان میں ہوتی ہیں۔ ان سے وہی سبق لے سکتا ہے جو اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہو۔

اے ایمان والو خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو۔ حالاں کہ تم کبھی اس کو لینے والے نہیں الّا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور بری بات کی تلقین کرتا ہے اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا اور اللہ وسعت والا ہے، جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت دے دیتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی دولت مل گئی۔ اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ۲۶۷-۶۹

آدمی دنیا میں جو کچھ کماتا ہے اس کو خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو شیطان کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو اللہ کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ آدمی کے ذاتی تقاضوں کی اہمیت اس کے دل میں بٹھاتا ہے۔ وہ اس کو سکھاتا ہے کہ تم نے جو کچھ کمایا ہے اس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کو اپنی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگاؤ۔ پھر جب شیطان دیکھتا ہے کہ آدمی کے پاس اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہے تو وہ اس کے اندر ایک اور جذبہ بھڑکا دیتا ہے۔ یہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ اب وہ اپنی دولت کو بے دریغ نمائشی کاموں میں بہانے لگتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دولت کو بہترین مصرف میں لگایا۔

آدمی کو چاہئے کہ اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اللہ کی چیز سمجھے۔ وہ اپنی کمائی میں سے اپنی حقیقی ضرورت کے بقدر لے لے اور اس کے بعد جو کچھ ہے اس کو بلند تر مقاصد میں لگائے۔ وہ خدا کے کمزور بندوں کو دے اور خدا کے دین کی ضرورتوں میں خرچ کرے۔ آدمی جب اللہ کے کمزور بندوں پر اپنا مال خرچ کرتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے اس بات کا امیدوار بن رہا ہوتا ہے کہ آخرت میں جب وہ خالی ہاتھ خدا کے سامنے حاضر ہو تو اس کا خدا اس کو اپنی رحمتوں سے محروم نہ کرے۔ اسی طرح جب وہ دین کی ضرورتوں میں اپنا مال دیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے مشن میں شریک کرتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خدا کے مال میں شامل کرتا ہے تاکہ اس کی حقیر پونجی خدا کے بڑے خزانہ میں مل کر زیادہ ہو جائے۔

جو شخص اپنے مال کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو حکمت و دانائی میں سے حصہ ملا ہے۔ سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی مال کی محبت میں مبتلا ہو اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے رک جائے اور سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ اقتصادی مفادات آدمی کے لئے اللہ کی راہ میں بڑھنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ وہ اپنے آپ کو خدا میں اتنا ملا دے کہ خدا کو اپنا اور اپنے کو خدا کا سمجھنے لگے۔ جو شخص ذاتی مصلحتوں کے خول میں جیتا ہے اس کے اندر وہ نگاہ پیدا نہیں ہو سکتی جو بلند تر حقیقتوں کو دیکھے اور اعلیٰ کیفیات کا تجربہ کرے۔ اس کے برعکس جو شخص ذاتی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے خدا کی طرف بڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو محدودیتوں سے اوپر اٹھاتا ہے، وہ اپنے شعور کو اس خدا کے ہم سطح کر لیتا ہے جو غنی و حمید اور وسیع و علیم ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ ان حد بندیوں کے پار ہو جاتا ہے جو آدمی کے لئے کسی چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں ـــــ کوئی بات خواہ کتنی ہی سچی ہو مگر اس کی سچائی کسی آدمی پر اسی وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اس کو کھلے ذہن سے دیکھ سکے۔

اور تم جو خرچ کرتے ہو یا جو نذر مانتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے اور اگر تم انھیں چھپا کر محتاجوں کو دو تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ تمھارے گناہوں کو دور کر دے گا اور اللہ تمھارے کاموں سے واقف ہے۔ ان کو ہدایت پر لانا تمھارا ذمہ نہیں۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے اپنے ہی لئے کرو گے۔ اور تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا چاہنے کے لئے۔ اور تم جو مال خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے لئے اس میں کمی نہ کی جائے گی۔ صدقات ان حاجت مندوں کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہوں، زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ناواقف آدمی ان کو غنی خیال کرتا ہے ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے۔ تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ اپنے مالوں کو رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۲۷۴ — ۲۷۰

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی سب سے بڑی مد یہ ہے کہ ان دینی خادموں کی مالی مدد کی جائے جو دین کی جد و جہد میں اپنے کو ہمہ تن لگا دینے کی وجہ سے بے معاش ہو گئے ہوں۔ ایک کامیاب تاجر کے پاس کسی دوسرے کام کے لئے وقت نہیں رہتا۔ ٹھیک یہی معاملہ خدمت دین کا ہے۔ جو شخص یک سوئی کے ساتھ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں لگائے اس کے پاس معاشی جد و جہد کے لئے وقت نہیں رہے گا۔ مزید یہ کہ ہر کام کی اپنی ایک فطرت ہے اور اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ آدمی کا ذہن ایک خاص ڈھنگ پر بناتا ہے۔ جو شخص تجارت میں لگتا ہے اس کے اندر دھیرے دھیرے تجارتی مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ تجارت کی راہ کی باریکیاں فوراً اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جب کہ دینی آدمی دین کے راستہ کی باتوں کو گہرائی کے ساتھ پکڑ نہیں پاتا۔ یہی معاملہ برعکس صورت میں خادم دین کا ہوتا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہو کیونکہ کسی معاشرہ میں دونوں قسم کے کاموں کا ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس معاشی وسائل جمع ہو گئے ہیں اس میں وہ ان لوگوں کا حصہ لگائیں جو دینی مصروفیت کی وجہ سے اپنی معاشیات فراہم نہ کر سکے۔ یہ گویا ایک طرح کی خاموش تقسیم کار ہے جو طرفین کے درمیان خالص رضائے الٰہی کے لئے وقوع میں آتی ہے۔ خادم دین نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے یکسو کیا تھا، اس لئے وہ انسان سے نہیں مانگتا اور نہ پانے کا امیدوار رہتا۔ دوسری طرف صاحب معاش یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس معاشی وسائل اس قیمت پر آئے ہیں کہ میں خدمت دین کی راہ میں وہ نہ کر سکا جو مجھ کو کرنا چاہئے تھا۔ اس لئے اس کی تلافی یہ ہے کہ میں اپنے مال میں اپنے ان بھائیوں کا حصہ لگاؤں جو گویا میری کمی کی تلافی خدا کے یہاں کر رہے ہیں۔

جب دین کی جد و جہد اس مرحلہ میں ہو کہ دین کے نام پر معاشی عہدے نہ ملتے ہوں، جب دین کی راہ میں لگنے والا آدمی بے روزگار ہو جائے، اس وقت دین کے خادموں کو اپنا مال دینا بظاہر ماحول کے ایک غیر اہم طبقہ سے اپنا رشتہ جوڑنا ہے۔ ایسے افراد پر خرچ کرنا مجلسوں میں قابل تذکرہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی حیثیت اور ناموری میں اضافہ نہیں کرتا۔ مگر یہی وہ خرچ ہے جو آدمی کو سب سے زیادہ اللہ کی رحمتوں کا مستحق بناتا ہے۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں نہ اٹھیں گے مگر اس شخص کی مانند جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ تجارت کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا۔ حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پھر جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لئے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو شخص پھر وہی کرے تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ پسند نہیں کرتا ناشکروں کو، گنہ گاروں کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے ۲۷۵ — ۷۷

بندوں کے درمیان باہمی طور پر جو معاشی تعلقات مطلوب ہیں ان کی علامت زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حقوق کا اعتراف یہاں تک کرتا ہے کہ وہ خود اپنی کمائی کا ایک حصہ نکال کر اپنے بھائی کو دیتا ہے۔ جو دین حقوق شناسی کا ایسا ماحول بنانا چاہتا ہو وہ سود کے زر پرستانہ طریقہ کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ ایسے معاشرہ میں باہمی لین دین تجارت کے اصول پر ہوتا ہے نہ کہ سود کے اصول پر۔ تجارت میں بھی آدمی نفع لیتا ہے۔ مگر تجارت کا جو نفع ہے وہ آدمی کی محنت اور اس کے خطرات مول لینے کی قیمت ہوتا ہے۔ جب کہ سود کا نفع محض خود غرضی اور زر اندوزی کا نتیجہ ہے۔

سود کا کاروبار کرنے والا اپنی دولت دوسرے کو اس لئے دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو مزید بڑھائے۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ یقینی شرح سے بڑھ رہا ہے۔ مگر اس عمل کے دوران وہ خود اپنے اندر جو انسان تیار کرتا ہے وہ ایک خود غرض اور دنیا پرست انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنی کمائی میں سے صدقہ کرتا ہے، جو دوسروں کی ضرورت مندی کو اپنے لئے تجارت کا سودا نہیں بناتا بلکہ اس کے ساتھ اپنے کو شریک کرتا ہے، ایسا شخص اپنے عمل کے دوران اپنے اندر جو انسان تیار کر رہا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف انسان ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے دل میں دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ جو ذاتی دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔

دنیا میں آدمی اس لئے نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ یہاں اپنی کمائی کے ڈھیر لگائے۔ آدمی کے لئے ڈھیر لگانے کی جگہ آخرت ہے۔ دنیا میں آدمی کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس کو آخرت کی جنتی دنیا میں بسایا جائے۔ جو لوگ اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے ان کو خدا جنت کا باشندہ بننے کے لئے چن لے گا۔ اور باقی تمام لوگ کوڑا کرکٹ کی طرح جہنم میں پھینک دئے جائیں گے ——— صدقہ کی روح حاجت مند کو اپنا مال خدا کے لئے دینا ہے اور سود کی روح استحصال کے لئے دینا۔ صدقہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی آخرت میں اپنے لئے نعمتوں کا ڈھیر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سود اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسی دنیا میں اپنے لئے ڈھیر لگانے کا خواہش مند ہے۔ یہ دو الگ الگ انسان ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا کے یہاں دونوں کا انجام یکساں قرار پائے۔ دنیا اسی کو ملتی ہے جس نے دنیا کے لئے محنت کی ہو، اسی طرح آخرت اسی کو ملے گی جس نے آخرت کے لئے اپنے اثاثہ کو قربان کیا۔

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کے لئے خبردار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کے تم حق دار ہو، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اور اگر ایک شخص تنگی والا ہے تو اس کی فراخی تک مہلت دو۔ اور اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا پورا مل جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۲۷۸ - ۸۱

معاشرہ کی اصلاح کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد نہ کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے اور نہ دوسرا کوئی اس کے اوپر زیادتی کرے۔ نہ کوئی کسی کے اوپر ظالم بنے اور نہ کوئی کسی کو مظلوم بنائے۔ سود خواری ایک کھلا ہوا معاشی ظلم ہے، اس لئے اسلام نے اس کو حرام ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ اسلامی اقتدار کے تحت سودی کاروبار کو فوجداری جرم قرار دیا۔ تاہم ایک سود خوار کو جس طرح دوسرے کے ساتھ ظالمانہ کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہے اسی طرح کسی دوسرے کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ سود خوار کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ کسی کا مجرم ہونا اس کو اس کے دیگر حقوق سے محروم نہیں کرتا۔ سود خوار کے خلاف جب کارروائی کی جائے گی تو صرف اس کے سودی اضافہ کو ساقط کیا جائے گا۔ اپنی اصل رقم کو واپس لینے کا وہ پھر بھی حق دار ہوگا۔ تاہم عمومی قانون کے ساتھ اسلام انسانی کمزوریوں کی بھی آخری حد تک رعایت کرتا ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ کوئی قرض دار اگر وقت پر تنگدست ہے تو اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک وہ اپنے ذمہ کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی کے ساتھ یہ تلقین بھی کی گئی کہ کوئی شخص قرض کی رقم ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اس کے ذمہ کی رقم کو سرے سے معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا کرو۔ معاف کرنے والا خدا کے یہاں اجر کا مستحق بنتا ہے اور دنیا میں اس کا یہ فائدہ ہے کہ معاشرہ کے اندر باہمی رعایت اور ہمدردی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو بالآخر سب کے لئے مفید ہے۔

تاہم صرف قانون کا نفاذ معاشرہ کی صلاح و فلاح کا ضامن نہیں۔ حقیقی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ میں تقویٰ کی فضا موجود ہو۔ اس لئے قانونی حکم بتاتے ہوئے ایمان، تقویٰ اور آخرت کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ جس طرح ایک سکولر نظام اسی وقت کامیابی کے ساتھ چلتا ہے جب کہ شہریوں کے اندر اس کے مطابق قومی کردار موجود ہو۔ اسی طرح اسلامی نظام اسی وقت صحیح طور پر وقوع میں آتا ہے جب کہ افراد کے قابل لحاظ حصہ میں تقویٰ کی روح پائی جاتی ہو۔ قومی کردار یا تقویٰ در اصل مطلوبہ نظام کے حق میں افراد کی آمادگی کا نام ہے۔ اور افراد کے اندر جب تک ایک درجہ کی آمادگی نہ ہو، محض قانون کے زور پر اس کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

مزید یہ کہ اسلام کی رو سے اصلاح معاشرہ بجائے خود مطلوب چیز نہیں ہے۔ اسلام میں اصل مطلوب فرد کی اصلاح ہے۔ معاشرہ کی اصلاح صرف اس کا ایک ثانوی نتیجہ ہے۔ قرآن جس ایمان، تقویٰ اور فکر آخرت کی طرف بلاتا ہے اس کا تحقق فرد کے اندر ہوتا ہے نہ کہ کسی اجتماعی ہیئت کے اندر۔ اس لئے قرآنی دعوت کا اصل مخاطب فرد ہے، اور معاشرہ کی اصلاح افراد کی اصلاح کا اجتماعی ظہور۔

اے ایمان والو، جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور اس کو لکھے تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اس کو سکھایا اسی طرح اس کو چاہئے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کر لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کو لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اس کو نہ لکھو۔ مگر جب یہ سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمھارے لئے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن رکھنے کی چیزیں قبضہ میں دے دی جائیں۔ اور اگر ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو چاہئے کہ جس پر اعتبار کیا گیا وہ اعتبار کو پورا کرے۔ اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہ گار ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو جاننے والا ہے ۲۸۲ ـ ۸۳

دو آدمیوں کے درمیان نقد معاملہ ہو تو لین دین ہو کر اسی وقت معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ادھار معاملات کی نوعیت مختلف ہے۔ ادھار معاملہ میں اگر ساری بات زبانی ہو تو کاغذی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بعد کو اختلاف پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ طرفین اپنے اپنے مطابق معاملہ کی تصویر پیش کرتے ہیں اور کوئی ایسی قطعی بنیاد نہیں ہوتی جس کی روشنی میں صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادائگی کے وقت اکثر دونوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا حل تحریر ہے۔ نقد معاملہ کو لکھ لیا جائے تو وہ بھی بہتر ہے۔ مگر ادھار معاملات کے لئے تو ضروری ہے کہ ان کو باقاعدہ تحریر میں لایا جائے اور اس پر گواہ بنائے جائیں۔ اختلاف کے وقت یہی تحریر فیصلہ کی بنیاد ہوگی ــ یہ مسلمان کے لئے تقویٰ اور عدل کی ایک [illegible] ہے۔ کتابت شدہ شرائط کے مطابق وہ اپنے حقوق کو ادا کر کے خدا اور خلق کے سامنے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

مسلمان خدا کے دین کے گواہ ہیں۔ جس طرح اللہ کی بات کو جانتے ہوئے چھپانا جائز نہیں، اسی طرح انسانی معاملات میں کسی کے پاس کوئی گواہی ہو تو اس کو چاہئے کہ اس کو ظاہر کر دے۔ گواہی کو چھپانا اپنے اندر مجرمانہ ذہن کی پرورش کرنا ہے اور معاملہ کے منصفانہ فیصلہ میں وہ حصہ ادا نہ کرنا ہے جو وہ کر سکتا ہے۔ انسان کا ضمیر چاہتا ہے کہ جب ایک چیز حق نظر آئے تو اس کے حق ہونے کا اعتراف کیا جائے۔ اور جب ایک چیز ناحق دکھائی دے تو اس کے ناحق ہونے کا اعلان کیا جائے۔ ایسی حالت میں جو شخص اپنے وقار اور مصلحت کی خاطر اپنی زبان کو بند رکھتا ہے وہ گویا ایسا مجرم ہے جو اپنے جرم پر خود ہی گواہ بن گیا ہو۔

اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ تم اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ رسول ایمان لایا ہے اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اترا ہے۔ اور مسلمان بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب۔ اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس کو ملے گا وہی جو اس نے کمایا اور اس پر پڑے گا وہی جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا ہم غلطی کر جائیں۔ اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی طاقت ہم کو نہیں۔ اور درگزر کر ہم سے۔ اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کارساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابل میں ہماری مدد کر

۲۸۴ — ۸۶

کائنات کی ہر چیز اللہ کے زیر حکم ہے۔ ذرہ سے لے کر ستاروں تک سب خدا کے مقررہ نقشہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اسی راستہ پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کے لئے خدا نے ان کو پابند کر دیا ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے کو خود مختار حالت میں پاتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ مگر انسان کی آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ امتحان کے لئے ہے۔ انسان کو بھی کائنات کے بقیہ اجزاء کی طرح خدا کی پابندی کرنی ہے۔ جس پابند زندگی کو بقیہ کائنات نے بزور اختیار کیا ہے وہی پابند زندگی انسان کو اپنے ارادہ سے اختیار کرنا ہے۔ انسان کو ظاہری صورت حال سے دھوکا کھا کر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہر وقت مالک کائنات کی نظر میں ہے، وہ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات کی نگرانی کر رہا ہے خواہ وہ اس کے اندر ہو یا اس کے باہر۔

وہ کون سا انسان ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت والا انسان ہے۔ ایمان سے مراد آدمی کی شعوری حوالگی ہے اور اطاعت سے مراد اس کی عملی حوالگی۔ شعور کے اعتبار سے یہ مطلوب ہے کہ آدمی اللہ کو اپنے خالق اور مالک کی حیثیت سے اپنے اندر اتارے۔ وہ اس حقیقت کو پا گیا ہو کہ کائنات کا نظام کوئی بے روح مشینی نظام نہیں ہے بلکہ ایک زندہ نظام ہے جس کو خدا اپنے فرماں بردار کارندوں کے ذریعہ چلا رہا ہے۔ اس نے خدا کے بندوں میں سے ان بندوں کو پہچان لیا ہو جن کو خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چنا۔ خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جو کتاب اتاری ہے اس کو وہ حقیقی معنوں میں اپنے فکر و خیال کا جزء بنا چکا ہو۔ رسالت اور پیغمبری اس کو پوری انسانی تاریخ میں ایک مسلسل واقعہ کی صورت میں نظر آنے لگے۔ ایمانیات کو اس طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لینے کے بعد وہ اپنی زندگی ہمہ تن اس کے نقشہ پر ڈھال دے۔ پھر یہ ایمان و اطاعت اس کے لئے کوئی رسمی اور ظاہری معاملہ نہ ہو بلکہ وہ اس کی روح کو اس طرح گھلا دے کہ وہ اللہ کو پکارنے لگے۔ اس کا وجود خدا کی یاد میں ڈھل جائے۔ اس کی زندگی تمام تر خدا کے اوپر نربھر ہو جائے۔

آیاتہا ۲۰۰　　سورۃ آل عمران مدنیۃ ۔ ۳　　رکوعاتہا ۲۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف ل م ۔ اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ اور سب کا تھامنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ، سچا کرنے والی اس چیز کو جو اُس کے آگے ہے اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اللہ نے فرقان اتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔ بے شک اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمھاری صورت بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے ۶-۱

کائنات کا خالق و مالک کوئی مشینی خدا نہیں بلکہ ایک زندہ اور باشعور خدا ہے۔ اس نے ہر زمانہ میں انسان کے لئے رہنمائی بھیجی۔ انھیں میں سے وہ کتابیں تھیں جو تورات و انجیل کی صورت میں پچھلے انبیاء پر اتاری گئیں۔ مگر انسان ہمیشہ یہ کرتا رہا کہ اس نے اپنی تاویل و تشریح سے خدا کی تعلیمات کو طرح طرح کے معنی پہنائے اور خدا کے ایک دین کو کئی دین بنا ڈالا۔ آخر اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آخری کتاب (قرآن) اتاری جو انسانوں کے لئے صحیح ہدایت نامہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ کسوٹی بھی جس سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کیا جا سکے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کا سچا دین کیا ہے اور وہ دین کون سا ہے جو لوگوں نے اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اب جو لوگ خدا کی کتاب کو نہ مانیں یا اپنی رایوں اور تعبیروں کے تحت گھڑے ہوئے دین کو نہ چھوڑیں وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے آنکھ دی مگر روشنی آجانے کے باوجود انھوں نے نہ دیکھا۔ جن کو خدا نے عقل دی مگر دلیل آجانے کے بعد بھی انھوں نے نہ سمجھا۔ اپنی جھوٹی بڑائی کی خاطر وہ حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئے۔

اللہ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے کیسا ہے، اس کا حقیقی تعارف خود وہی کر سکتا ہے۔ اس کی ہستی کا دوسری موجودات سے کیا تعلق ہے، اس کو بھی وہ خود ہی صحیح طور پر بتا سکتا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب میں اس کو اتنی واضح صورت میں بتا دیا ہے کہ جو شخص جاننا چاہے وہ ضرور جان لے۔ یہی معاملہ انسان کے لئے ہدایت نامہ مقرر کرنے کا ہے۔ انسان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سا رویہ ہے جو انسان کی کامیابی کا ضامن ہے، اس کو بتانے کے لئے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ انسان کے لئے صحیح رویہ وہی ہو سکتا ہے جو بقیہ کائنات سے ہم آہنگ ہو اور دنیا کے وسیع تر نظام سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہو۔ انسان کے لئے صحیح راہ عمل کا تعین وہی کر سکتا ہے جو نہ صرف انسان کو پیدائش سے موت تک جانتا ہو بلکہ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پیدائش سے پہلے کیا ہے اور موت کے بعد کیا۔ ایسی ہستی خدا کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ انسان کے لئے حقیقت پسندی یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ خدا پر بھروسہ کرے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو پورے یقین کے ساتھ پکڑ لے۔

دی ہے جس نے تمھارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو نہ پھیر جب کہ تو ہم کو ہدایت دے چکا۔ اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے۔ بے شک تو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔ اے ہمارے رب، تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ۹ — ۷

قرآن میں دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی معلوم دنیا سے متعلق ہیں، مثلاً تاریخی واقعات، کائناتی نشانیاں، دنیوی زندگی کے احکام وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جو آج کے انسان کے لیے ناقابل ادراک ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات، جنت دوزخ کے احوال، وغیرہ۔ پہلی قسم کی باتوں کو قرآن میں محکم انداز، بالفاظ دیگر براہِ راست اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی باتیں انسان کی نامعلوم دنیا سے متعلق ہیں، وہ انسانی زبان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لیے ان کو متشابہ انداز یعنی تمثیل و تشبیہ کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان کا ہاتھ کہا جائے تو یہ براہ راست زبان کی مثال ہے اور اللہ کا ہاتھ تمثیلی زبان کی مثال۔ جو لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ متشابہ آیتوں کا مفہوم بھی اسی طرح متعین کرنے لگتے ہیں جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی ہمیشہ بھٹکتا رہے اور کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ کیوں کہ "انسان کے ہاتھ" کو متعین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر "خدا کے ہاتھ" کو موجودہ عقل کے ساتھ متعین طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

متشابہات کے سلسلہ میں صحیح علمی و عقلی موقف یہ ہے کہ آدمی اپنی محدودیت کا اعتراف کرے۔ جن باتوں کو وہ متعین صورت میں اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لا سکتا ان کے مجمل تصور پر قناعت کرے۔ جب حواس کی محدودیت کی وجہ سے انسان کے لیے ان حقائق کا کلی احاطہ ممکن نہیں تو حقیقت پسندی یہ ہے کہ ان امور میں تعیّنات کی بحث نہ چھیڑی جائے۔ اس کے بجائے اللہ سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ آدمی کو اس قسم کی بے نتیجہ بحثوں میں الجھنے سے بچائے۔ وہ آدمی کو ایسی عقل سلیم دے جو اپنے مقام کو پہچانے اور ان حقائق کے مجمل یقین پر راضی ہو جائے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب کہ یہ حقیقتیں اپنی تفصیلی صورت میں کھل کر سامنے آجائیں مگر آدمی جب تک امتحان کی دنیا میں ہے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

جس طرح راستہ کی پھسلن ہوتی ہے اسی طرح عقل کے سفر کی بھی پھسلن ہے۔ اور عقل کی پھسلن یہ ہے کہ کسی معاملہ کو آدمی اس کے صحیح رخ سے نہ دیکھے۔ کسی چیز کی حقیقت آدمی اسی وقت سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کو اس رخ سے دیکھے جس رخ سے اس کو دیکھنا چاہیے۔ اگر وہ کسی اور رُخ سے دیکھنے لگے تو عین ممکن ہے کہ وہ صحیح رائے قائم نہ کر سکے اور غلط فہمیوں میں پڑ کر رہ جائے۔ سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جان لے کہ کسی چیز کو دیکھنے کا صحیح ترین رخ کیا ہے۔

شکایت کے وقت حق پر قائم رہنا

قال عمر: ما عاقبت من عصی اللہ فیك بمثل ان تطیع اللہ فیہ (تفسیر ابن کثیر جلد ثالث، صفحہ ۴۲۶)

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو شخص تمھارے بارے میں اللہ کی نافرمانی کرے، تم اس کے بارے میں اللہ کی اطاعت کرو۔ یہی اس کا سب سے بہتر بدلہ ہے۔

بے خوف انسان ایمانی جذبات کو سمجھ نہیں سکتا

بزار نے ابوسلمہ رض اور ابوہریرہ رض سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ میں ایک لشکر بھیجنا چاہتا ہوں، تم لوگ اس کے خرچ کے لئے صدقہ دو۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض ایک تاجر آدمی تھے انھوں نے کہا اے خدا کے رسول! میرے پاس چار ہزار ہیں۔ دو ہزار میرے گھر والوں کے لئے ہیں اور دو ہزار میں اپنے رب کو قرض دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

بارك اللہ لك فیما اعطیت وبارك لك فیما امسکت

اللہ تمھیں اس چیز میں برکت دے جو تم نے دیا اور اس چیز میں برکت دے جو تم نے روکا

ابوعقیل انصاری رض ایک غریب آدمی تھے۔ انھوں نے ساری رات ایک باغ والے کے یہاں پیٹھ پر پانی لاد کر سینچائی کی۔ اس کی مزدوری میں ان کو دو صاع (سات سیر) کھجوریں ملیں۔ انھوں نے ایک صاع کھجور اپنے گھر والوں کے لئے چھوڑی اور ایک صاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے ان کے لئے بھی برکت کی دعا فرمائی جس طرح عبدالرحمٰن بن عوف رض کے لئے کی تھی۔

مگر مدینہ کے منافقین نے دونوں پر طعن وطنز شروع کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض کے متعلق کہا: اس شخص نے محض دکھانے کے لئے دیا ہے (ما اعطی الا ریاء) دوسری طرف ابوعقیل رض کی بابت کہا: "اللہ اور رسول کیا اس کے اس صاع سے مستغنی نہ تھے؟"

انسان سے کچھ نہ مانگنا

ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من یکفل لی ان لا یسئال الناس شیئا اتکفل لہ بالجنۃ (کون مجھ سے اس بات کا کفیل بنتا ہے کہ وہ کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کرے گا) حضرت ثوبان رض نے کہا "میں" چنانچہ اس کے بعد وہ کسی شخص سے کسی بھی چیز کا سوال نہیں کرتے تھے (احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

کیفیات کے لئے حالات ضروری ہیں

ترمذی نے ابوامامہ رض سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس خدا کا فرشتہ آیا اور کہا اے محمد! اللہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم چاہو تو مکہ کے پتھریلے میدان کو تمھارے لئے سونے سے بدل دیا جائے۔ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا:

لا یارب، ولکن اشبع یوما واجوع یوما۔ فاذا جعت

اے میرے رب نہیں۔ بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ ایک دن سیر ہو کر

تضرعت الیك وذکرتك واذا شبعت شکرتك وحمدتك

کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے گڑگڑا کر مانگوں اور جب میری ہو تو میں تیرا شکر کروں اور تیری تعریف کروں

قلب کا سخت ہو جانا سب سے بڑی سزا

قال مالك بن دینار ماضرب عبد بعقوبة اعظم من قسوة القلب (دوم ۸)

مالک بن دینار نے کہا۔ دل کی سختی سے زیادہ بڑی سزا کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی

اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے

ابو عمران رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ہم لوگ قسطنطنیہ کے غزوہ میں تھے۔ ہمارے امیر لشکر عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔ رومیوں کی طرف سے ایک بڑی فوج نکلی۔ ہماری طرف سے ایک مہاجر نے نکل کر رومیوں پر حملہ کیا اور ان کی صفوں کو توڑ دیا۔ یہ دیکھ کر ہم میں سے کچھ لوگوں نے کہا: القی بیدہ الی التھلکۃ (اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا) ہمارے لشکر میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے کہا: نحن اعلم بھذہ الآیۃ انما نزلت فینا (ہم انصاری اس آیت کی بابت زیادہ جانتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ہمارے بارے میں اتری تھی) پھر انھوں نے بتایا کہ جب اللہ نے اپنے نبی کی مدد فرمائی اور اسلام غالب ہو گیا تو ہم نے آپس میں کہا: آؤ اب اپنی جائدادوں میں رہیں اور اپنے مال کی طرف توجہ دیں۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت اتاری: وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو):

فالالقاء بایدینا الی التھلکۃ ان نقیم فی اموالنا ونصلحھا وندع الجھاد (تفسیر ابن کثیر جلد اول)

پس اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ ہم اپنے مالوں میں ٹھہریں اور اس کی درستی میں لگیں اور جہاد کو چھوڑ دیں

ناراضگی کے وقت کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو جاؤ

عن اسلم عن عمرؓ قال لا یکن حبك کلفا ولا بغضك تلفا۔ فقلت کیف ذالك۔ قال اذا احببت کلفت کلف الصبی واذا ابغضت احببت لصاحبك التلف (الادب المفرد، صفحہ ۱۹۱)

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی کے ساتھ محبت میں دیوانے نہ ہو جاؤ اور دشمنی کے وقت اس کو تکلیف پہنچانے نہ لگو۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ آپ نے کہا: اس طرح کہ جب تم محبت کرو تو بچوں کی مانند محبت کرو اور جب کسی سے ناراض ہو تو اس کی تباہی و بربادی چاہو۔

جان اور مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں

بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لیے آیا۔ میں نے پوچھا: اے خدا کے رسول! آپ مجھ سے کس چیز پر بیعت لیں گے۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: گواہی دو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پانچ وقت کی نمازیں ان کے وقتوں پر ادا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ رمضان کے

روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، اللہ کے راستہ میں جہاد کرو"۔ میں نے کہا: "اے خدا کے رسول میں سب کروں گا۔ مگر ان میں سے دو کی میرے اندر طاقت نہیں، ایک زکوٰۃ۔ خدا کی قسم میرے پاس صرف دس اونٹنیاں ہیں۔ انھیں کا دودھ میرے گھر والوں کی خوراک ہے اور یہی ان کی سواری اور بار برداری کا ذریعہ ہیں۔ دوسرے جہاد۔ میں ایک کمزور دل کا آدمی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس نے جہاد سے پیٹھ پھیری وہ اللہ کے غضب میں آگیا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر جنگ میں شرکت کرنی پڑی تو مجھ پر ڈر غالب آجائے اور میں بھاگ کھڑا ہوں۔ اور اللہ کے غضب کا مستحق بن جاؤں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا:

یا بشیر لا صدقۃ ولا جہاد فبم اذن تدخل الجنۃ (کنز العمال)

اے بشیر! نہ صدقہ نہ جہاد، پھر کیسے تم جنت میں داخل ہوگے

سوال اور غیر سوال کا فرق

مالک نے عطاء بن یسار سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عطیہ بھیجا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: تم نے کیوں اس کو واپس کر دیا۔ انھوں نے کہا: اے خدا کے رسول! کیا آپ نے ہم کو نہیں بتایا کہ ہم میں سے ہر ایک کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی سے کوئی چیز نہ لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما ذلک عن المسألۃ، فاما ما کان عن غیر مسألۃ فانما ھو رزق یرزقکہ اللہ

وہ بات میں نے سوال کے بارہ میں کہی تھی۔ مگر جو چیز بغیر سوال کے آئے تو وہ رزق ہے جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اب کسی چیز کے لئے میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ مگر جو چیز بغیر سوال کے میرے پاس آئے گی اس کو ضرور لوں گا۔

شہرت سے دور بھاگنا

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بعد کے زمانہ میں بکریاں چرانے لگے تھے۔ وہ مدینہ سے دور ایک میدان میں اپنی بکریاں چرا رہے تھے کہ ایک روز ان کے لڑکے عمرو بن سعد سوار ہو کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ کیا آپ نے اس کو پسند کیا ہے کہ بھیڑ بکریوں میں بدو بنے رہیں۔ حالاں کہ لوگ مدینہ میں حکومت و سیاست کے معاملات پر بحثیں کر رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی نے اپنے بیٹے کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا: چپ رہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو ڈرنے والا ہو، بے نیاز ہو اور لوگوں سے چھپا ہوا ہو (اسکت انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ یحب العبد التقی الغنی الخفی۔ مسلم)

علم نام ہے اللہ سے خوف کا

عن عون بن عبد اللہ قال قال عبد اللہ بن مسعود لیس العلم بکثرۃ الروایۃ انما العلم خشیۃ اللہ

عبد اللہ بن مسعود نے کہا۔ علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے علم یہ ہے کہ آدمی اللہ رب العالمین سے ڈرنے لگے۔

مذہب کیا ہے

مذہب کا عام تصور یہ ہے کہ مذہب کسی فرد کا ایک خالصتہً نجی معاملہ ہے۔ اس کے ردعمل میں دوسرا تصور یہ پیدا ہوا کہ مذہب مکمل طور پر ایک اجتماعی معاملہ ہے۔ یہ دونوں، یکسر غلط نہ ہونے کے باوجود، اصل حقیقت کی صرف ادھوری تشریح ہیں۔ دونوں میں سے کوئی جملہ صحیح طور پر اس نوعیت کو واضح نہیں کرتا جو مذہب اور انسان کے درمیان ہے یا ہونا چاہئے۔ اصل یہ ہے کہ مذہب انسان کے لئے روحانی طور پر وہی ہے جو مادی طور پر اس کے لئے خون ہے۔ خون سارے بدن کی زندگی ہے۔ وہ پورے جسم کو متحرک کرتا ہے۔ اسی طرح مذہب ایک انسان کی زندگی ہے۔ وہ اس کے پورے وجود کے حرکت وعمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ مذہب آدمی کا طرز فکر ہے، وہ آدمی کا شعور ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جو روح کی تڑپ بن جاتی ہے۔ مذہب جب اس طرح کسی کے اندر داخل ہو جائے تو انفرادی یا اجتماعی الفاظ اس کے لئے اضافی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو واقعہ ظہور میں آتا ہے وہ یہ کہ آدمی کی زندگی اندر سے باہر تک مذہب میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ مذہب کی فکر سے سوچتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مذہب کے تابع ہو جاتی ہیں۔ جو عمل بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے، مذہب کے زیر اثر ظاہر ہوتا ہے۔ مذہب اس کے لئے ایک ایسا رنگ بن جاتا ہے جس میں اس کی پوری زندگی رنگ اٹھتی ہے، اندر بھی اور باہر بھی۔ کسی آدمی کا مذہب وہ رسمی عقیدہ نہیں ہے جس کو اس نے انفرادی عقیدہ کے طور پر اختیار کیا ہو۔ اسی طرح کسی آدمی کا مذہب وہ خشک نظریہ نہیں ہے جس کو اس نے اجتماعی نظریہ کے عنوان سے اپنی تقریر وتحریر کا موضوع بنا رکھا ہو۔ آدمی کا مذہب حقیقتہً وہ فکر ہے جو آدمی پر اس طرح چھا جائے کہ اس کی پوری ہستی اس میں نہا اٹھے۔ اس اعتبار سے آدمی جس چیز کو اختیار کرے وہی اس کا مذہب ہے خواہ وہ معروف معنوں میں کوئی مذہب ہو یا مذہب کے علاوہ کوئی چیز۔

انسان اپنے وجود کے اعتبار سے ایک ہم آہنگ کل ہے۔ اسی طرح وہ ایک ایسا فکر چاہتا ہے جو ہم آہنگ کل کی حیثیت رکھتا ہو۔ انسان کی ہستی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کے وجود کے مختلف حصے اور اس کی مختلف صلاحیتیں ایک "انا" کا جزء بن گئی ہوں۔ یہی حال فکر کے معاملہ کا بھی ہے۔ آدمی ایک کلی فکر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مختلف حواس کے ذریعہ وہ جو معلومات حاصل کرتا ہے ان کو جوڑ کر جب تک وہ ایک ہم آہنگ فکری مجموعہ کی حیثیت نہ دے لے وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کا کلی فکر حقیقت پر مبنی ہو یا اس نے غرضی طور پر اپنا ایک فکری ڈھانچہ بنا لیا ہو۔ اس اعتبار سے تاریخ میں اب تک جتنے فکری نظام سامنے آئے ہیں ان کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

GOD-CENTRED THINKING	یعنی خدا مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ اسلام ہے
MAN-CENTRED THINKING	یعنی انسان مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ ہندوازم ہے
SOCIETY-CENTRED THINKING	یعنی سماج مرکزی فکر،	اس کا نمائندہ سوشلزم ہے

اسلام خدا مرکزی دین ہے۔ مگر جب بگاڑ آتا ہے تو لوگ اسلام کی ایسی تشریح کرنے لگتے ہیں جو عام انسانی یا سماجی تصورات کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ خدا کا دین، اسلامی اصطلاحوں میں، انسان مرکزی دین بن جاتا ہے یا سماج مرکزی دین۔

دنیا پرستی اُن کا دین بھی ہے اور اِن کا بھی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان دنیوی چیزوں (عَرَضَ دنیا) کا حریص ہے۔ جب کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ آخرت کو اپنا مقصود بنائے (انفال ۶۷) دنیا کی چیزوں کا شوق کرنا اور ان کی طرف دوڑنا انسان کا عام مرض ہے۔ تمام خرابیوں کی اصل جڑ یہی ہے۔ خدا فراموشی اور بے انصافی کی تمام قسمیں اسی سے وجود میں آتی ہیں۔ جو لوگ خدا کے دین کو نہیں مانتے، وہ یہ کہہ کر دنیا طلبی میں مشغول ہوتے ہیں کہ "زندگی بس یہی موجودہ دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں جینا اور یہیں مر جانا ہے۔ گردش ایام کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے اوپر حکمراں ہو (جاثیہ ۲۴) ان کے سوا وہ لوگ جو دین خدا کے قائل ہیں، ان کے درمیان دنیا طلبی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ ہم خدا کے خاص بندے ہیں اور ہماری مغفرت ضرور ہو جائے گی (سیغفر لنا) یہ عقیدہ ان کو خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بے خوف کر دیتا ہے۔ وہ اسی دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں جس کی بابت ان کی آسمانی کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جو اس میں غرق ہوا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (بقرہ ۲۰۰) دین کے منکر جس دنیا پرستی کو آخرت کا انکار کر کے لئے ہوئے ہیں، اسی دنیا پرستی کو وہ اس احساس کے تحت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم آگ سے محفوظ لوگ ہیں، ہم جن نبیوں اور بزرگوں کو مانتے ہیں وہ بہر حال ہم کو خدا کے یہاں بخشوا لیں گے خواہ ہم جو کچھ کرتے رہیں۔ حتی کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ کی دنیا پرستی پہلے گروہ سے زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ دوسروں کی طرح صرف دنیا حاصل کرنے پر نہیں رکتے بلکہ اپنی مخصوص نفسیات کے تحت یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کی دینی توجیہات شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح خود اللہ کے دین کو ایک دنیوی سودا بنا دیتے ہیں، وہ اپنی خلاف حق کارروائیوں میں اللہ کو بھی ایک فریق بنا لیتے ہیں

وہ دنیا کے مال و دولت پر فریفتہ ہو کر اس کے اوپر ٹوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ رسمی قسم کی دین داری کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔ وہ عہدہ اور شہرت اور لیڈری کے لئے اٹھتے ہیں اور کتاب آسمانی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ عین خدا کے دین کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف سے یہ مشن سپرد کیا جاتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو آنے والے ہولناک دن سے باخبر کریں مگر وہ سماجی امن، معاشی انصاف اور سیاسی اصلاح کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کا طوفان مچاتے ہیں اور خدائی تعلیمات کی خود ساختہ تشریح کر کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ عین اسی کام کے لئے اٹھے ہیں جس کے لئے خدا نے اپنے نبیوں کو بھیجا تھا۔

مگر جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں، جو اپنے آپ کو اس اصلاحی نقشہ پر ڈھالنا چاہتے ہوں جو اللہ کو پسند ہے، وہ موجودہ عارضی دنیا کی چیزوں میں گم نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کی ابدی دنیا کو اپنا مقصود بنائیں گے۔ وہ نفسانی رجحانات سے آزاد ہو کر خدا کی کتاب کو پکڑیں گے۔ ان کا شعار اللہ کے آگے جھکنا ہوگا نہ کہ دنیوی مصالح کی پرستش کرنا (اعراف ۱۷۰) — دنیا کی جن چیزوں کے پیچھے ایک گروہ دوڑ رہا ہے، انھیں کے پیچھے اگر دوسرا گروہ دوڑنے لگے تو وہ اس لئے نہیں چھوٹ جائے گا کہ اس نے دین کے نام پر ایسا کیا تھا۔

دنیا کی زندگی میں حقیقتوں سے پردہ نہیں ہٹایا گیا ہے۔ یہاں آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ خوبصورت الفاظ میں اپنی اندرونی بے مائگی کو چھپا سکے۔ زرق برق سواریوں اور شان دار مجالس میں ظاہر ہو کر لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکے کہ جس شخص کے جلو میں اتنی عزتیں اور شوکتیں چل رہی ہیں وہ ضرور حق پر ہوگا۔ تاہم "خصام" کے وقت ایسے شخص کا بھرم کھل جاتا ہے۔ جب کسی سے اس کا جھگڑا پیش آجائے تو خوبصورت باتیں کرنے والا شخص فوراً بدکلامی پر اتر آتا ہے، وہ اپنے لبادہ کو اتار پھینکتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھتے ہیں کہ حسین پردہ کے اندر ایک بدہیئت انسان چھپا ہوا تھا۔ ایسے شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ جہاں صرف باتوں اور تقریروں کا جوہر دکھانا ہو وہاں تو وہ خوب اونچی اونچی باتیں کرتا ہے اس کی زبان سے قومی تعمیر، باہمی امن، بزرگوں کی روایات کا تحفظ اور معیاری انسانی سماج کے قیام کی باتیں نکلتی ہیں۔ مگر تقریر کے اسٹیج سے اتر کر جب وہ اپنے عملی دائرہ میں آتا ہے جہاں اس کو خود اُن اچھی باتوں کے قائم کرنے کا اختیار ہے جو اس نے اپنی تقریر میں کہی تھیں تو اچانک وہ بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنی کبریائی قائم کرنے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں خاندان برباد ہوں، کسی کی معاشیات تباہ ہو جائیں، ماحول میں اصلاح کے بجائے فساد برپا ہو۔ جب اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تمہارا عمل تمہاری بات کے مطابق نہیں تو گھمنڈ کی نفسیات اس کے لئے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے کو گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

اللہ کے نزدیک ایسے خوش گفتاروں کی کوئی قیمت نہیں، اس کو تو وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی زندگی کی قیمت پر حق کو اختیار کریں۔ جب حق کو قبول کرنے کے لئے اپنے کو بے عزت کرنے کا سوال ہو، جب اپنے مقابلہ میں دوسرے کی بڑائی کا اعتراف کرنا پڑے، جب دنیوی مصالح سے بے پروا ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہو تو آدمی ہچک کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو حق کی واحد قیمت ہے۔ اور جو شخص حق کی قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو وہ اس کا خریدار کیسے بن سکتا ہے۔

اللہ کو وہ بندے پسند ہیں جو اللہ کی طرف اس طرح بڑھیں کہ اپنی ذات اور اپنے قلب و دماغ کو انھوں نے ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا ہو۔ اس کے سوا کسی اور کی وفاداری ان کے دل میں باقی نہ رہے۔ شیطان مختلف طریقوں سے آدمی کی وفاداری کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ کبھی مصلحتوں کو سامنے لاتا ہے، کبھی کسی فائدے کا لالچ دیتا ہے۔ کبھی کسی نقصان سے ڈراتا ہے۔ کبھی عزت کے سوال کو سامنے کھڑا کرتا ہے۔ اس قسم کے وساوس ڈال کر شیطان چاہتا ہے کہ آدمی خدا سے بس رسمی تعلق رکھے اور اپنے حقیقی معاملات اور اپنی روز و شب کی زندگی میں اپنی دل پسند راہوں پر چلتا رہے۔ "اسلام میں پورا داخل نہ ہونا" یہ ہے کہ آدمی عبادتی آداب میں خدا کے سامنے سر جھکائے مگر جب خدا کا کوئی بندہ اس کے سامنے خدا کی ایک دلیل پیش کرے تو وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ نماز میں صف بندی کا اہتمام کرے مگر جب راہ خدا میں متحدہ جد و جہد کا سوال ہو تو اتحاد میں شامل نہ ہو۔ وہ قرآن کے الفاظ کو ادا کرنے میں مخارج کی درستگی پر خوب زور دے مگر قرآن میں اپنی زندگی کی رہنمائی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے۔ روزہ میں وہ کھانا پینا ترک کرنے میں کوتاہ نہ ہو مگر جھوٹ بولنے اور جھوٹے کام کرنے سے روزہ نہ رکھے۔

امتحان کس بات کا

قرآن میں آدم کا قصہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس نے کہنا نہ مانا اور تکبر کیا اور انکار کرنے والا ہو گیا۔ اور ہم نے کہا: اے آدم تم اور تمھاری عورت جنت میں رہو اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالم قرار پاؤگے۔ پھر شیطان نے دونوں کو لغزش میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس عیش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ ہم نے کہا: تم سب اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے اور تم کو زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک مدت تک (بقرہ)

اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ ص ۷۶) اس کے مقابلہ میں فرشتے ذاتی بڑائی کے احساس سے خالی تھے۔ وہ ساری بڑائی صرف اللہ کے لئے تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے اللہ کا حکم پاتے ہی وہ ایک حقیر مخلوق کے آگے سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ابتدا میں دو واضح کردار انسان کے سامنے رکھ دئے۔ ایک ابلیسی کردار۔ دوسرا ملکوتی کردار۔ ابلیس رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ مگر انسان کو تمام ترغیبات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم مسلک بنانا ہے۔

کوئی دولت، شہرت، اقتدار میں بڑھ جائے تو آدمی جلنے لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے سوا کسی کو بڑا دیکھنا نہیں چاہتا غیر شخص کی زبان سے حق کا اعلان ہو تو وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسا کرنا دوسرے کی فکری عظمت تسلیم کرنے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کسی پر تنقید کر دی جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ناقد اس کی بڑائی کو چیلنج کر رہا ہے۔ خاموش تعمیری کام میں ساتھ دینے کے لئے بمشکل چند آدمی ملتے ہیں۔ اور کسی حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلائیے تو بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کی سیاست میں بڑے کی بڑائی کا انکار کرنے کے جذبہ کو تسکین مل رہی ہے۔ انسان کی اصل کمزوری ہے اپنے سوا کسی کے لئے بڑائی کو تسلیم نہ کرنا۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی اصل خوبی اللہ کی نظر میں یہ ہے کہ آدمی ذاتی بڑائی کے احساس کو مٹا دے اور اللہ کا حکم آتے ہی فوراً جھک جائے خواہ یہ جھکنا اپنے سے کمتر کا اعتراف کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

جو لوگ "ظالم" حکمرانوں کے خلاف اٹھتے ہیں بہت جلد ان کے گرد انسانوں کا غول جمع ہو جاتا ہے۔ ہجوم کو دیکھ کر اس قسم کے قائدین اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کے ملک میں ظلم کرنے والا بس وہی ایک شخص ہے جو اقتدار کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے۔ باقی تمام لوگ عدل و انصاف کے عاشق ہیں۔ اگر اس ظالم کو کسی طرح تخت سے ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد ہر طرف انصاف کا سیلاب بہہ پڑے گا۔ ہر طرف امن کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مگر یہ شدید ترین غلط فہمی ہے۔ "ظالم" کے اقتدار کو چیلنج کرنے والی تحریکوں کے گرد انسانوں کا غول حقیقۃً ملکوتی نفسیات کے تحت جمع نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس غیر ملکوتی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا شکار ہمیشہ تمام قومیں ہوتی رہی ہیں۔ کسی کے اقتدار کو چیلنج کرنا اس نفسیات کے لئے مرغوب ترین چیز ہے۔ جب کوئی قائد اس قسم کا منفی نعرہ

لے کر اٹھتا ہے تو یہ نفسیات مدد کرتی ہے اور لوگ بآسانی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ظلم" کو مٹانے کے نام پر جتنی تیزی سے اتحاد قائم ہوتا ہے، "عدل" کو قائم کرنے کے وقت وہ اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو گرانے کے لئے اٹھنا غیر حکوتی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ ایسی تحریکیں اٹھانا زمین میں فساد برپا کرنا ہے نہ کہ اصلاح اور انصاف قائم کرنا۔ بے دینی کو اگر دین کا نام دے دیا جائے تو محض نام کی وجہ سے وہ دین داری نہیں ہو جائے گی۔

ابلیس کو انسان کے اوپر کوئی اقتدار حاصل نہیں۔ اس کے بہکانے کا طریقہ تزئین (حجر ۳۹) ہے۔ یعنی غلط روش کو صحیح بنا کر دکھانا۔ اسی تدبیر کے ذریعہ وہ رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ ہر وہ موقع جہاں حق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے سامنے "جھک" جائے، جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اپنے مقابلہ میں دوسرے کی صداقت کا اعتراف کرلے، بس وہیں ابلیس آجاتا ہے اور آدمی کی نفسیات میں داخل ہو کر اس کو اکسانے لگتا ہے کہ وہ فرشتوں والی روش پر نہ جائے اور اس کی اپنی روش کو اختیار کرلے۔ وہ "جھکنے" کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرے۔ انسانی تعلقات کی تمام برائیاں خواہ وہ خاندان کے اندر ہوں یا خاندان سے باہر، ہمیشہ کسی نہ کسی شکایت پر شروع ہوتی ہے۔ ایک خلاف مزاج بات آدمی کے سامنے آتی ہے اور اس پر وہ بھڑ اٹھتا ہے۔ ہر ایسے موقع پر ایک طرف خالص حق کا تقاضا ہوتا ہے اور دوسری طرف انانیت اور بے انصافی کا۔ مگر آدمی حق کے تقاضے کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے بھائی کا عدو (دشمن) بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہی ہے۔ اسی قسم کے معاملات میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون وہ تھا جو فرشتوں کی راہ پر چلا اور کون تھا جس نے ابلیس کے طریقہ کو اختیار کیا۔ کس نے ابدی جنت کا استحقاق پیدا کیا اور کون اس کا مستحق ٹھہرا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ پیش آتا ہے، اس وقت ایک روش وہ ہوتی ہے جو حق کے مطابق ہے۔ دوسری وہ ہوتی ہے جو ضد، نفرت، انانیت، خود غرضی اور انتقام جیسے جذبات سے ابھرتی ہے۔ دوبارہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ ایک شخص کی زندگی میں اس تاریخ کو دہرایا جائے جو تخلیق آدم کے وقت پیش آئی تھی۔ ایسے موقع پر خدا اپنے نبیوں کے ذریعہ بھیجی ہوئی ہدایت کی زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ "اے بندے حق کے آگے جھک جا"۔ دوسری طرف شیطان اس کو ورغلا رہا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ انانیت والے اس طریقے کو اختیار کرے جو خود اس نے تخلیق آدم کے وقت اختیار کیا تھا۔ ساری انسانی تاریخ اسی دو طرفہ کشمکش کی داستان ہے۔ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو یا غریب، جاہل ہو یا عالم، لیڈر ہو یا پیرو، عورت ہو یا مرد، سب اسی دو طرفہ پکار کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے یہ آزمائش روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں پیش آتی ہے اور کسی کے لئے بڑے قابل ذکر واقعات میں۔ کوئی اپنے پڑوسی، اپنے رشتہ دار، اپنے کرایہ دار، اپنے شریک تجارت کے مقابلہ میں اس امتحان میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کوئی قوموں اور حکومتوں کے مقابلہ میں۔ ہر بار جب ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کسی معاملہ پر عداوت ابھرتی ہے تو اس امتحان کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی حق کے آگے "جھکنے" کی روش اختیار کرے، وہ فرشتوں کا ساتھی بنا اور جو شخص انانیت کے طریقہ پر چلے وہ ابلیس کی برادری میں شامل ہو گیا۔ ایک کے لئے ابدی جنت ہے اور دوسرے کے لئے ابدی جہنم۔

فطرت کی تصدیق

سیدھا رکھو اپنا رخ دین پر ایک طرف کا ہوکر۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر پیدا کیا لوگوں کو۔ بدلنا نہیں ہے اللہ کے بنائے کو۔ یہی ہے دین سیدھا۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ سب رجوع ہوکر اس کی طرف۔ اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور قائم کرو نماز اور نہ ہوجاؤ شرک کرنے والوں میں۔ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور ہوگئے فرقے فرقے۔ ہر گروہ اس پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارنے لگتے ہیں اس کی طرف رجوع ہوکر۔ پھر جب اللہ چکھاتا ہے ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی تو ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ منکر ہوجائیں ہمارے دئے ہوئے سے۔ پس چند روز فائدہ اٹھالو۔ جلد ہی تم جان لوگے (روم ۳۴-۳۰)

آدمی کیا ہے۔ امیدوں اور حوصلوں اور تمناؤں کا ایک مجموعہ۔ آدمی اپنی عین بناوٹ کے لحاظ سے ایک مرکز چاہتا ہے جس کی طرف وہ اپنی توجہات کو مرتکز کردے، جس کی طرف وہ لپکے، جس کی یاد کو لئے ہوئے وہ سوئے اور جاگے، اپنے وجود کو ہمہ تن جس کے حوالے کردے۔ جس طرح کسی آدمی کے بس میں نہیں کہ اپنے اندر سے کھانے اور پانی کی طلب کو ختم کردے، اسی طرح کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان احساسات سے اپنے آپ کو خالی کرسکے ——— آدمی جب ان پہلوؤں سے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائے تو یہ توحید ہے اور جب کوئی دوسری چیز اس کی توجہات کا مرکز بن جائے تو اسی کا نام شرک ہے۔

توحید یا خدا پرستی کے داخل فطرت ہونے کا یہاں ایک نہایت سادہ ثبوت دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی نہ کسی وقت ہر شخص کو ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اپنے مشکل وقتوں میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا ایسا تقاضا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوسکی۔ آدمی خواہ مشرک ہو یا منکر، جب ڈر کا لمحہ آتا ہے تو حقیقت کھل جاتی ہے اور اس کی فطرت بے اختیار اسی ایک خدا کو پکارنے لگتی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اسی بنا پر کسی نے کہا ہے کہ خدا اگر موجود نہ ہو تب بھی ضروری ہوگا کہ خدا کو ایجاد کیا جائے:

If God did not exist, it would be necessary to invent him

مطلب یہ کہ انسان خدا جیسی ایک ہستی کا اتنا زیادہ محتاج ہے کہ وہ اس سے کسی حال میں خالی نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ اگر خدا فی الواقع موجود نہ ہو تو وہ خود سے اپنا ایک معبود گھڑے گا اور اس کو خدا کی طرح پکارے گا۔ تاکہ اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبات کو تسکین دے سکے۔

توحید کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنالے۔ مگر جب بگاڑ آتا ہے تو کچھ اشخاص لوگوں کا مرکز توجہ بن جاتے ہیں۔ ہر گروہ کسی زندہ یا مردہ شخصیت کے گرد جمع ہوجاتا ہے۔ ہر گروہ فضل و کمال کا ایک ایسا معیار بنالیتا ہے جس میں اس کی اپنی محبوب شخصیت سب سے زیادہ اونچی دکھائی دے۔ اس طرح ہر گروہ کے گرد فرضی خوش خیالیوں کا ایک قلعہ تیار ہوجاتا ہے جس میں پناہ لے کر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی دنیا و آخرت کو محفوظ کرلیا۔ اب خدا پرستی کے نام پر انسان پرستی دین میں داخل ہوجاتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دین ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کئی دینوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

حق کا انکار کرنے والے

حق کا انکار کرنے کی دو بہ عام طور پر دو ہوتی ہیں۔ ظلم اور علو (نمل ۱۴) ظالم سے مراد ہے غیر صحیح۔ یعنی وہ لوگ جو مفاد اور مصلحت کے پجاری ہوں۔ اور صحیح اور غلط کا فرق کئے بغیر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور علو پسند وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر کبر اور گھمنڈ کی نفسیات لئے ہوئے ہوں۔ ظلم کی پیدائش کی زمین اگر مفاد پرستی ہے تو علو کی پیدائش کی زمین خود پرستی۔

حق کی دعوت جب کھل کر سامنے آتی ہے تو وہ تمام لوگ اس سے متوحش ہو جاتے ہیں جو صحیح اور غلط کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر دنیا سمیٹنے میں لگے ہوئے ہوں اور دل کے اندر کوئی خواہش پیدا ہونے ہی کو اپنے لئے کافی معیار سمجھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ حق کے پیغام کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بنائی ہوئی زندگی کو درہم برہم کر دیا جائے۔ ہاتھ پاؤں اور زبان پر روک، کمانے کے طریقوں میں حرام و حلال کا لحاظ، معاملات میں صحیح اور غلط کی تمیز، لوگوں کے ساتھ نمٹنے میں انصاف اور بے انصافی کا فرق، یہ چیزیں جو حق کا لازمی تقاضا ہوتی ہیں، ان کو جنجال نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی آزاد زندگی پر روک لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس لئے وہ حق کو قبول نہیں کرتے۔

دوسرا گروہ علو پسندوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو حالات کسی اونچی گدی پر پہنچائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ماحول میں عزت اور شہرت کا مقام ملا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے حق کی دعوت آتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے اس کے حق ہونے کا اقرار کر لیا تو ان کی بڑائی کا مقام ان سے چھن جائے گا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو مذہب کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ہوں، وہ سب سے پہلے اس پیچیدگی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عوام کو یہ باور کرائے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ جس مذہب کے نمائندے ہیں وہی اصل مذہب ہے۔ ایسی حالت میں اپنے سے باہر کسی حق کو ماننا اپنے کو گدی سے اتارنے کے ہم معنی ہوتا ہے اور ملی ہوئی گدی سے اترنا آدمی کے لئے ہمیشہ مشکل ترین چیز رہا ہے۔ وہ دنیا میں اپنے وقار کو بچانے کی خاطر حق کا انکار کر دیتے ہیں، خواہ یہ انکار ان کے آخرت کے وقار کو مشتبہ بنا دے۔

ظلم اور علو میں مؤخر الذکر زیادہ شدید قسم کی رکاوٹ ہے۔ سورۂ یوسف میں مصر کی امرأۃ عزیز کا قصہ نقل ہوا ہے۔ وہ ایک وقت حضرت یوسف کی شدید مخالف بن گئی تھی۔ اس کے بعد حضرت یوسف کی براءت کا ایک چھوٹا سا واقعہ اس کے سامنے آیا۔ یعنی خواب کے بارے میں آپ کی تعبیر کا صحیح ہو جانا۔ اس کو سن کر وہ پکار اٹھی: الآن حصحص الحق (اب حق بات ظاہر ہو گئی) دوسری طرف اسی مصر میں فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ نے مسلسل بڑے بڑے معجزے دکھائے۔ مگر وہ آخر وقت تک آپ کی صداقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ عزیز مصر کی عورت کا معاملہ ظلم یعنی ذاتی مفاد یا ہوس کا معاملہ تھا۔ جب کہ فرعون مصر کا معاملہ علو یعنی کبر اور گھمنڈ کا معاملہ تھا۔ جو شخص ذاتی مفاد کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ اگر اس کو قبول نہ کرے گا تو اس کا امکان ہے کہ وہ زبان سے اس کا اعتراف کرے۔ مگر جو شخص اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ نہ اس کو قبول کرے گا اور نہ اس کا اعتراف کرے گا۔ ایسا شخص اپنی متکبرانہ نفسیات کے تحت بنے ہوئے ذہنی خول میں زندگی گزارتا رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کے خود ساختہ ذہنی خول سے اس کو باہر لانے میں کامیاب ہو۔

دین میں الحاد

قرآن میں انسان کی جن گمراہیوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک دین میں الحاد ہے۔ الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السھم الھدف یعنی تیر نشانہ کے اِدھر اُدھر سے نکل گیا، اصل نشانہ پر نہیں لگا۔ دین میں الحاد یہ ہے کہ دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینے کے بجائے کسی بدلی ہوئی حیثیت میں لینا۔ مثلاً اللہ کے نام (اسمار حسنیٰ) ہم کو اس لئے بتلائے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کی برتری اور کمال کا تصور کریں اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا ادراک کرکے اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں۔ اسمار حسنیٰ سے اپنے لئے اس قسم کی غذا لینا دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینا ہے۔ اس کے بجائے اسمار حسنیٰ میں الحاد یہ ہے کہ اس کو سحر اور سفلی عملیات کے لئے استعمال کیا جائے۔ یا مثلاً اللہ کو قرآن میں ملک (بادشاہ) کہا گیا ہے۔ اب دنیوی بادشاہ پر قیاس کرتے ہوئے یہ نظریہ بنایا جائے کہ جس طرح بادشاہوں کے یہاں کچھ مصاحب اور مقرب ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی مصاحب اور مقرب ہیں اور وہ ان کی سفارش کو اسی طرح سنتا ہے جس طرح دنیوی بادشاہ اپنے مصاحب اور مقرب کی سفارش کو سنتے ہیں۔

دین میں اس قسم کا الحاد یا انحراف اس کی تمام تعلیمات میں ہوتا ہے۔ آدمی دین کی اصل شاہراہ سے ہٹ کر کسی اور سمت میں چل پڑتا ہے اور لفظی تاویلات کے ذریعہ اپنے کو سمجھاتا رہتا ہے کہ وہ دینِ خداوندی پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اللہ کے نام اور کلام کو عملیاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح "اسلامی عملیات" کے نام سے سحر و کہانت کو اسلام میں داخل کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسلام کے آداب اور عبادات کو مال و اولاد کی برکت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس طرح اسلام کو اپنی مادہ پرستانہ زندگی کا ضمیمہ بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ قومی مسائل کے لئے احتجاج اور مطالبات اور دوروں اور تقریروں میں مشغول ہوتے ہیں اور اپنی اس قوم پرستانہ مہم کو اسلام کی اصطلاحات میں بیان کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلام کا اصل مدعا ہے۔ کچھ لوگ اقتدار اور لیڈری کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کی تاویل کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلامی سیاست ہے اور وہ اسلام کی سیاسی سربلندی قائم کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دینی مسائل میں خود ساختہ بحثیں اور موشگافیاں نکالتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ادارے قائم کرکے کہتے ہیں کہ وہ دینی تعلیم کا کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ عملیاتی مشقیں ایجاد کرتے ہیں اور اس کو اسلام کا نام دے کر کہتے ہیں کہ یہ اسلامی روحانیت ہے۔ کچھ لوگ جدال اور مناظرہ کے اکھاڑے قائم کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سب دین میں الحاد ہے۔ اس قسم کا الحاد آدمی کو دین سے دور کرنے والا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی دین سے قریب سمجھتا ہو۔

دین میں الحاد یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے نام پر کرنے کے بجائے دنیا کو دین کے نام پر کیا جانے لگے۔ آدمی اپنی نمود و نمائش کے لئے اٹھے اور اس کو دین کا نام دے۔ وہ اپنے دنیوی حوصلوں کو پورے کرنے کے لئے سرگرم ہو اور یہ اعلان کرے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ وہ اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کے لئے کام کرے اور ثابت کرے کہ یہی قرآن و سنت کا عین مدعا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اسلام کے پیچھے چلائے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایسا کرے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق چلے اور اسلام کی تاویل کرکے اس کو اپنے مطابق ڈھال لے تو یہ الحاد ہے جو اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔

قولی ایمان اور قلبی ایمان

قرآن کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو زبان سے ایمان کے کلمات بول دینے کے ہم معنی ہو۔ دوسرا وہ جب کہ آدمی کا ایمان اس کے قلب کے اندر داخل ہو جائے۔ (توبہ) ایک کو قولی ایمان اور دوسرے کو قلبی ایمان کہہ سکتے ہیں۔

قولی ایمان کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ آدمی زبان سے ایمان کا کلمہ بول دے مگر اس کا ایمان عملی اطاعت نہ بنے۔ وہ زبان سے کہے کہ "میں اللہ اور رسول پر ایمان لایا" مگر روزانہ کی زندگی میں اس کی دلچسپیاں اور مختلف معاملات میں اس کی سرگرمیاں اللہ اور رسول سے آزاد ہو کر بسر ہو رہی ہوں۔ اللہ اس کی توجہ کا مرکز نہ بنے اور رسول کو وہ اپنی زندگی کے لئے نمونہ نہ ٹھہرائے۔ اس کی زندگی بھی عملاً ویسی ہی ہو جیسی ان لوگوں کی ہوتی ہے جنھوں نے ایمان کا اقرار نہیں کیا ہے۔ اس کا قلب اللہ کی یاد سے خالی ہو اور اس کی کارروائیاں اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر نہ آئیں۔ جب کسی کا یہ حال ہو تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمان کا کلمہ تو بول دیا ہے مگر وہ اس کے دل میں اس طرح داخل نہیں ہوا ہے کہ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جائے اور اس کی زندگی کو بدل دے۔

جب آدمی قولی ایمان کی سطح پر ہو تو اس کا ایمان اس کو جو چیز دیتا ہے وہ بس قولی بحثیں ہیں۔ اس کو اپنی خامیوں سے زیادہ دوسروں کی خامیوں کی خبر ہوتی ہے جس کو وہ جوش کے ساتھ بیان کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایسے مشاغل ڈھونڈ لیتا ہے جس میں تقریروں اور اخباری بیانات جیسے "قولی" کارناموں کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلام کی خدمت کا کریڈٹ ملتا ہو۔ اس کو ایسے پروگرام حاصل ہو جاتے ہیں جس میں دوسروں کے خلاف الفاظ کا طوفان برپا کرنا یا دوسروں کے خلاف سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کرنا وہ چیز ہو جس پر اسلامی نظام قائم کرنے کا تمغہ عطا کیا جائے۔ وہ اسلام پر بحث و مباحثہ کی بے شمار ایسی صورتیں دریافت کر لیتا ہے جس میں دنیا کی ہر چیز زیر بحث آئے مگر اس کی اپنی ذات ہمیشہ مستثنیٰ رہے۔

قلبی ایمان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ قلبی ایمان جب کسی کو ملتا ہے تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گلاس کے پانی میں رنگ پڑ جائے۔ ایسا ایمان اس کی پوری ہستی میں تیر جاتا ہے۔ وہ اس کے قلب و دماغ میں سما جاتا ہے، وہ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ اس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے۔ وہ اس کا ذہن بن جاتا ہے جس سے وہ سوچتا ہے۔ وہ اس کے دل دھڑکن اور اس کی توجہات کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہے اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہے۔ ایسا ایمان آدمی کو فکر و خیال کی ایک ابدی دنیا دے دیتا ہے جس میں وہ جیے۔ وہ اس کو نظر آنے والی کائنات کے اندر ایک اور کائنات کا تجربہ کرا دیتا ہے جس کا وہ باسی بنے۔ ایسے آدمی کے قدم دنیا میں چلتے ہیں مگر اس کے احساسات خدا میں گم رہتے ہیں۔ وہ بظاہر دنیا کی چیزوں کو برتتا ہے مگر حقیقۃً وہ آخرت کے عالم میں سانس لینے لگتا ہے۔ اس کا ایمان اس کے لئے خدا سے ملنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

قلب کی سطح پر جس کو ایمان ملتا ہے تو وہ اس کی زندگی کا محض ایک رسمی ضمیمہ نہیں ہوتا بلکہ وہی اس کی کل زندگی بن جاتا ہے وہ اس کے لئے بے روح عملیات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہی اس کی اصل ہستی ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی صبح و شام کرتا ہے۔ اس کے لئے ایمان خارجی دنیا پر غور و بحث کا عنوان نہیں ہوتا بلکہ خود اپنا احتساب کرنے کا عنوان ہوتا ہے۔ وہ باہر کے ظالموں کو اقتدار

سے بے دخل کرنے کے بجائے اس جدوجہد میں لگ جاتا ہے کہ اپنے دل کی سلطنت سے نفس اور شیطان کو بے دخل کرے۔ الفاظ کے کارنامے دکھانے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ خاموشی اور گم نامی کی دنیا میں اسلافی تعمیر کا محل کھڑا کرتا ہے۔ عوامی اسٹیج پر مظاہرے کرنا اس کو بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس بزم کا ہم نشین بن جاتا ہے جہاں خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے نیک بندوں کی محفل لگی ہوئی ہے۔ اس کا عمل وہ عمل بن جاتا ہے جو خدا کو عمل نظر آئے نہ کہ وہ عمل جو انسانوں کو عمل دکھائی دیتا ہے مگر خدا کے یہاں اس کی کوئی عملی قیمت نہیں ہوتی۔

ایک لیڈر کو شہرت کے کاموں سے دل چسپی ہوتی ہے۔ وہ ان راہوں میں دوڑتا ہے جو اس کی عوامی مقبولیت کو بڑھائے، جس سے اس کے جاہ و مرتبہ میں اضافہ ہو۔ اس کے گرد و پیش کتنے ہی خشک ذمہ داریوں والے انتہائی ضروری کام موجود ہوتے ہیں مگر وہ اس کو نظر نہیں آتے۔ حتیٰ کہ توجہ دلانے پر بھی وہ ان کی اہمیت کو اور ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتا۔ البتہ اس کا ذہن ایسے کاموں کو دریافت کرنے میں بہت زرخیز ہوتا ہے جس کے عنوان پر وہ پریس کانفرنس کر سکے۔ جس کے ذریعہ وہ اخبار کی سرخیوں میں نمایاں ہو۔ جو اس کو بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع فراہم کرتے ہوں۔ جو اس کو ٹرنک کال کرنے اور ہوائی جہاز پر ادھر سے اُدھر اُڑنے کا جواز عطا کرتے ہوں۔ جن کے نتیجہ میں اس کو یہ موقع ملے کہ وہ سجے ہوئے پنڈال میں کھڑے ہو کر الفاظ کا دریا بہائے اور لوگوں سے تھپلیاں اور استقبالئے وصول کرے۔ مگر اللہ کے سچے بندے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ خدا کی طرف بھاگنے والا ہوتا ہے نہ کہ شہرت کے کاموں کی طرف بھاگنے والا۔ اس کو ان کاموں سے دل چسپی ہوتی ہے جن کو خدا دیکھ رہا ہے نہ کہ وہ کام جو انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ سچا مومن وہ ہے جو دل ہی دل میں اپنے احتساب میں مشغول رہتا ہو جس کو اس بات کی فکر لگی رہتی ہو کہ اس سے یا اس کے اہل خاندان سے اس کے پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو اللہ کو یاد کرے اور اہل معاملہ کے درمیان اپنی ذمہ داریوں کو خاموشی کے ساتھ ادا کرتا رہے۔ جس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو کہ اس کو جہنم میں نہ ڈال دیا جائے اور جس کی سب سے بڑی تمنا یہ ہو کہ اس کا خدا اس کو جنت کے باغوں میں جگہ دے۔ بندۂ مومن کے عمل کا محرک اللہ کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہوتا ہے نہ کہ عوام کے سامنے شہرت و عزت حاصل کرنا۔ عوام کے درمیان اپنی "امیج" بڑھانے کے لئے کام کرنا گویا عوام کو خدا کی جگہ بٹھانا ہے۔ یہ خدا کے بجائے عوام کو اپنا مرکز توجہ بنانا ہے۔ یہ ریا ہے اور ریا کو حدیث میں شرک کہا گیا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے عمل میں مشغول ہوں وہ اپنے لئے یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ وہ خدا کے یہاں مجرموں اور فسادیوں کے زمرہ میں شامل کر دئے جائیں۔ کوئی شخص اگر اپنے اس مشغلہ کے لئے دین و ملت کا عنوان دریافت کرلے تو اس سے مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بے دینی کو اگر دین کے نام پر کیا جانے لگے تو محض نام بدلنے سے کوئی شخص خدا کی پکڑ سے مامون و محفوظ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کا جرم کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نے اپنے غیر خدا پرستانہ کاروبار کے لئے خدا کا نام استعمال کیا ——— موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ الفاظ بول کر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال سکے۔ ایک بے فائدہ کام کو ایسے عمدہ پیرایہ میں بیان کرے کہ وہ لوگوں کو اہم معلوم ہونے لگے اور لوگ اس کے لئے اپنی جیبیں خالی کر دیں اور حق در حق جمع ہو کر اس کی شان قیادت میں اضافہ کریں۔ مگر آخرت میں ایسا ممکن نہ ہوگا، کیوں کہ وہاں حقیقت کی حکمرانی ہوگی نہ کہ الفاظ کی حکمرانی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

حقیقت کی تلاش

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۶۰۔ قیمت ایک روپیہ

دین کی سیاسی تعبیر

(تعبیر کی غلطی کا خلاصہ)

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۰ قیمت —/۲

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

قرآن شریف اور تمام تبلیغی و درسی کتب اور مولانا وحید الدین خاں صاحب کی تمام مطبوعہ کتب ہر وقت مل سکتی ہیں۔ الرسالہ، الفرقان، تعمیر حیات، ندائے ملت، نقیب، رضوان ملنے کا پتہ:

رفیق احمد، مکتبہ عزیزیہ، نورانی مسجد، مالیگاؤں ناسک

اسلام کا تعارف

ازمولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۴، قیمت ۰/۵۰

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

ازمولانا وحید الدین خاں

صفحات ۸۰ قیمت ۲/۰۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

سوشلزم

ایک غیر اسلامی نظریہ

ازمولانا وحید الدین خاں

صفحات ۷۲۔ قیمت ۲/۰۰

مارکسزم

تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۴۸ قیمت ۳/۰۰

مکتبہ الرسالہ

جمعیت بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

عربی مطبوعات

مولانا وحیدالدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (مطبوعہ قاہرہ) برائے فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں :

۱۔ الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲۔ الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	"	۱۰	روپے
۳۔ حكمة الدين	۸۷	صفحات	"	۸	روپے
۴۔ الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	"	۸	روپے
۵۔ مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	"	۲	روپے
۶۔ نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	"	۲	روپے
۷۔ إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	"	۲	روپے
۸۔ الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	"	۲	روپے
۹۔ المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۷۲	صفحات	"	۵	روپے
۱۰۔ نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	"	۵۰	پیسے

آپ کی تندرستی اور صحت کا تقاضہ ہے
کہ پہلے اپنے ملک کی جڑی بوٹیوں سے بنی
ہوئی دوائیں استعمال کریں ——

ھمدم دَوَاخَانہ

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۰، دلی ۶

اپنے ملک کی جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی دوائیں
۱۹۱۶ء سے پیش کر رہا ہے۔

چند معیاری مطبوعات

	ہدیہ
تدبر قرآن (جلد اول) مفسر امین احسن اصلاحی ۔ اردو، فوٹو آفسٹ	۳۲-۰۰
دی میننگ آف گلوریس قرآن مترجم مارماڈیوک پکتھال انگریزی فوٹو آفسٹ پیپر بیک	۱۱-۰۰
دی میننگ آف گلوریس قرآن مترجم مارماڈیوک پکتھال انگریزی عربی فوٹو آفسٹ	۲۲-۰۰
نماز احکام الصلوٰۃ، خوش نما ٹائیٹل، فوٹو آفسٹ	۵-۰۰
نماز مترجم (مع ضروری مسائل) فوٹو آفسٹ	۱-۵۰
قرآن معری عکسی نمبر ۳، جدید ترین کتابت، بمعہ پلاسٹک کور	۱۹-۰۰
قرآن مجید، حوالہ نمبر ۵۳، معری عکسی، ریگزین بائنڈنگ	۱۲-۰۰
حمائل شریف، حوالہ نمبر ۲۳، بمعہ پلاسٹک کور	۱۳-۰۰
اعمال قرآنی، معری عکسی ریگزین بائنڈنگ	۵-۰۰
قاعدے اور سپارے	
کرامات صحابہ، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۰-۰۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۹-۰۰
مجموعۂ درود شریف، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۱-۵۰
آداب زندگی، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۴-۵۰
نسخۂ کیمیا، خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۷-۵۰
قرآنی نصیحتیں (انگریزی) خوش نما ٹائیٹل، پلاسٹک لیمینیشن	۶-۰۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان، دھلی ۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

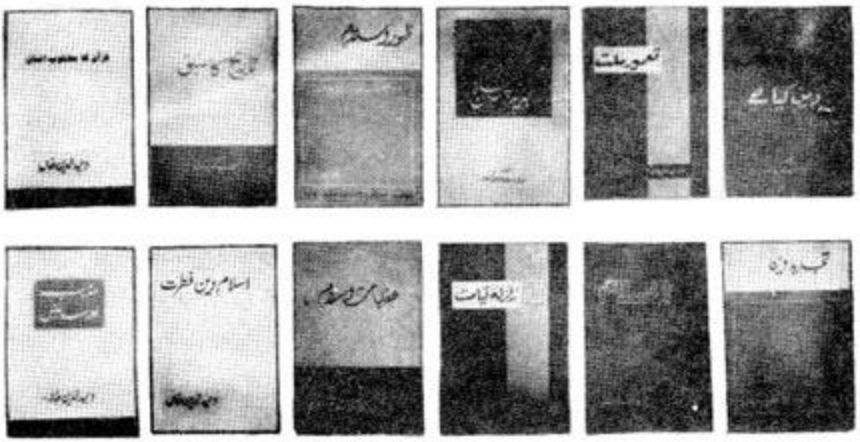

- دین کیا ہے
  صفحات ۳۲ قیمت ۵۰/۱ روپے
- تعمیرِ ملت
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- ظہورِ اسلام
  صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲/- روپے
- تاریخ کا سبق
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- مذہب اور سائنس
  صفحات ۷۲ قیمت ۴/-
- تجدیدِ دین
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- الاسلام
  صفحات ۱۸۹ قیمت ۱۲/- روپے
- زلزلۂ قیامت
  صفحات ۶۴ قیمت ۳/- روپے
- عقلیاتِ اسلام
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- پیغمبر اسلام
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/-
- مذہب اور جدید چیلنج
  صفحات ۲۲۴ قیمت ۵۰/۱۳ روپے
- اسلام دینِ فطرت
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- اسلامی دعوت
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے
- قرآن کا مطلوب انسان
  صفحات ۸۰ قیمت ۵۰/۴ روپے
- سبق آموز واقعات
  صفحات ۴۸ قیمت ۲/-

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

RECD. R. N. NO. 28822/76
RECD. D. (D) NO. 532

February 1980
Issue No. 39

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006 INDIA PHONE 262331

Pakistan International Airlines'
Karachi and Lahore.
It's just like coming home-
there's nothing better.

For home is where welcome is. Home is a PIA flight. Where you slip into comfort, sit back and savour the warmth of familiar hospitality.

It's truly special—your PIA flight to Karachi and Lahore. As you journey to past times and places no longer out of reach. A flight to old dreams come true.

Or to any of 60 destinations in 40 countries. And all the while, with Pakistan International Airlines, you've never really left home.

PIA
Pakistan International

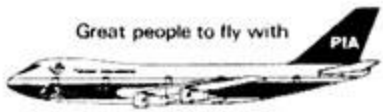

For enquiries and reservations contact your nearest travel agent or Pakistan International Airlines, Kailash Building, 26 Kasturba Gandhi Marg, New Delhi 110 001. Tel: 43161/43162
Oberoi Towers, Nariman Point, Bombay 400 021. Tel: 231373/231455

KARACHI
LAHORE